جلوۂ صد رنگ

ڈاکٹر برج پریمی

جلوۂ صد رنگ

ڈاکٹر برج پریمی

JALWA - E - SADRANG

By :- DR. BRIJ PREMI

PRICE :- Rs. 75/-

جلوۂ صد رنگ

(کلچرل اکادمی ریاست جموں وکشمیر سے انعام یافتہ)

ڈاکٹر برج پریمی

دیپ پبلی کیشنز

"تپسیا" ۵۸۔ آزاد بستی، نٹی پورہ، سرینگر کشمیر

۱۰۔ ٹیچرس کوارٹرس، یونیورسٹی کیمپس، حضرت بل، سری نگر۔

پہلی بار ——— ۱۹۸۵ء

دوسری بار ——— ۱۹۸۹ء

تعداد ——— ۵۰۰

مطبع ——— فوٹو لیتھو ورکس، دہلی

ناشر ——— دیپ پبلی کیشنز، سری نگر (کشمیر)

قیمت ——— ۷۵ روپے

تقسیم کار :—

دیپ پبلی کیشنز

"تپسیا" ۵۸۔ آزاد بستی، نٹی پورہ، سرینگر

کشمیر

ماں کے نام

اس کتاب میں

پیش گفتار

اردو دنیا کا کشمیر سے تعارف کچھ اتھلا اتھلا سا رہا ہے اور وہ کشمیر کو عام طور پر اس کے عوام اور اس کی اسطور سے الگ تھلگ کر کے دیکھتے ہیں لیکن ابتدا ہی میں فوق اور اقبال کا ذکر کسی طرح ٹالا نہیں جا سکتا کہ وہ صورت حال کا بالکل ہی الگ رخ پیش کرتے ہیں اور اگر ان کی تمہید میں کوئی کوتاہی کی جائے تو اس ساری منطق کی بساط ہی الٹ جائے گی۔ فوق اور اقبال دونوں کشمیری تھے اور دونوں نے اردو میں کشمیر کے داغ داغ وجود اور اس کی روح کا نوحہ چھیڑ دیا۔ ابھی وقت کا تناظر ان دونوں شخصیات کو خالص اسطوری حیثیت بخشنے میں مانع ہے لیکن آئندہ یگوں میں یہ بات سب مانیں گے کہ کشمیری بیداری کی طرح انہوں نے ہی ڈالی اور اس کی شناخت کا سب سے بلند آہنگ ترانہ انہوں نے ہی چھیڑا لیکن یہ پس منظر اردو کے دوسرے ادیبوں کے سرسری اور رسمی رویئے کو اور بھی زیادہ شدید بنا دیتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ اردو ادب کشمیر کے

ذکر سے خالی رہا ہے۔ ہر دور میں اردو کے ادیب اور خاص طور شاعر اس موضوع کو بڑا مرغوب موضوع پاتے رہے ہیں لیکن وہ زیادہ تر انہی جذبات کی بازگشت کرتے ہیں۔ جو اکبر بادشاہ کے درباری شاعر فیضیؔ نے ظاہر کئے تھے اور جس میں انہوں نے یہاں تک خیال کا پیچ لڑایا تھا کہ انہیں بھنے ہوئے مرغ کشمیر کی فضاؤں میں بال و پر سے دوبارہ آراستہ ہوتے ہوئے نظر آئے تھے۔ فیضی حکمران طبقے کے ترجمان تھے اور وہ ان انسانوں پر نظر ڈالنے سے معذور تھے جو دن رات ستم ہائے روزگار کی جہنم آسا بھٹی میں کباب ہو رہے تھے لیکن بعد میں جب کشمیریوں کو ہوش آیا تو انہوں نے اس انداز کو "ترٹ بازی" (گپ مارنے) سے تشبیہ دی۔ بہر کیف اردو کا ادیب یا تو اپنے احساس برتری یا اپنی تہذیبی کم مائیگی کی وجہ سے کشمیر کا کوئی بامعنی اور بھرپور عکس نہیں ابھار سکا وہ کشمیر کو ایک جاگیردار کے رومانی مزاج کے فرزند کی آنکھ سے دیکھنے کا عادی رہا۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیر سے متعلق اردو کے ادیبوں کی تحریریں کشمیر کے عرفان کو عام کرنے میں ناکام رہیں۔ ہاں عزیز احمد کے چند ناول اس سلسلے میں اپنی خامیوں کے باوجود بس غنیمت ہیں۔ کرشن چندر اور دوسرے بڑے ادیب بھی کشمیر سے متعلق سلمان رشدی کے انگریزی ناولوں سے مشابہ کوئی چیز پیش نہ کر سکے۔ ان حالات میں اس خلیج کو پاٹنے کا مسئلہ واقعی سنگین نوعیت اختیار کر لیتا ہے۔ اردو کا ادیب تو کشمیر پر اس لئے اپنا حق سمجھتا ہے کہ یہاں کی سرکاری زبان اردو قرار دی گئی ہے۔ وہ اردو کے لئے اس ریاست سے ڈھیر ساری رعایتوں کا بھی طلب گار ہے لیکن اسے اب بھی اس ترسیل کی واپسی لہر میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے نہ تو کشمیر کی روح کا جھروکہ کھول کر اس کے "قعر دریا آتشیں" باطن سے واقف ہونے میں دلچسپی ہے اور نہ کشمیر کے اردو ادیب کے ساتھ برابری کی سطح پر پیش آنے کا خیال ہے۔ یہی بات تو یہ ہے کہ چند مغز استثناءات کے بغیر

جو بہر حال اس کلیے کو ہی درست ثابت کرتے ہیں، اردو کے ادیب کشمیر کے اردو نگاروں کے متعلق اپنی خلوتوں میں بہت اچھی آرا کا اظہار نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں تو اُس کی کیفیت بقول شاعر ایسی ہوتی ہے ؎

اہلِ ثروت جیسے دیتے ہوں غریبوں کو زکوٰۃ

ان حالات میں اس ترسیلی خلیج کو پاٹنے کی صلیب کشمیر کے اردو ادیب کو ہی اٹھانا پڑ رہی ہے اور خوشی کا امر ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا کام کسی رعونت کے بغیر پوری دیانت داری اور اہلیت کے ساتھ کر رہا ہے۔

برج پریمی کے اس مجموعے کو میں اس سلسلے کی ایک اہم کڑی سمجھتا ہوں۔ پریمی نے اگرچہ اردو کی کارگاہ میں اپنے اظہار کا جلوہ دیکھنے اور اپنے آپ کی تفہیم کی کاوش کی ہے لیکن اس کا بالواسطہ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ اردو دنیا کے لئے کشمیر کے لمنت ہائے معتبر کو پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ابھی اردو دنیا کو سعادت حسن منٹو پر پریمی کے وقیع اور شاندار کام کی پوری آگہی نہیں ہے۔ لیکن جوں جوں منٹو کی اسطور کی لَو اونچی ہوتی جا رہی ہے اور پریمی کا تخلیقی اور تنقیدی کام عام ہوتا جا رہا ہے اُن کے کارنامے کی قدر و قیمت بڑھتی جا رہی ہے۔ یہ بات کسی شک و شبہے کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ آئندہ منٹو کو اپنے دور کے چوکھٹے میں دیکھنے اور ان کے ذہنی وفاداریوں کے سوتے دریافت کرنے میں پریمی کے کام سے اغماض برتنا بہت مشکل ثابت ہوگا۔ پریمی کا زیرِ نظر مجموعہ اسے منٹو کتھا کے دائرے سے باہر لا کر ایک آزاد نظر ادیب کی حیثیت سے ہمارے سامنے لا کھڑا کر دیتا ہے۔ جس کے ذہنی اور فکری انہماکات کشمیر کے ظاہر و باطن پر محیط ہیں جس کے رومانی ارتباط بڑے متنوع اور رنگا رنگ ہیں جس کے مطالعے کا عمق قابلِ تعریف ہے اور جس کے بات کہنے کا ڈھنگ دل کو بھاتا ہے۔ کشمیر شناسی کا جو پیرایہ اس نے اختیار کیا ہے۔ وہ کشمیریوں

کے بڑھتے ہوئے قومی شعور اور انفرادی اعتماد کے ساتھ ساتھ اردو قاری کے لئے کچھ ان لکھے، نا آشنا مگر بے حد شاندار مناظر کی کھڑکیاں کھولتا ہے۔ وہ جب کشمیر پر کچھ پڑھنا چاہتا ہے تو عموماً اسے کشمیر پر غیر ملکی مصنفین کی انگریزی کتابیں یاد آ جاتی ہیں۔ نہ معلوم اسے کیوں ان موضوعات پر لکھی گئی اردو کتابیں اب بھی ایسی لگتی ہیں جیسے بقول نیاز فتح پوری "جھوٹ بولا جا رہا ہو" ان کے نازک مزاج پر گراں نہ ہو تو انہیں یہ اطلاع دینے میں کوئی ہرج نہیں کہ اس کتاب کے بعد اب ان کے شیلف کے لئے کشمیر کی تواریخ و ثقافت کے بارے میں ایک قابلِ اعتبار و استناد کتاب آ گئی ہے۔ برج پریمی نے اس کتاب میں کشمیر کی تواریخ و تمدن کے وسیع گوشوں کو کھلی ہوئی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ یہ درست ہے کہ ان میں سے تقریباً ہر ایک موضوع پر ایک الگ تصنیف پیش کی جا سکتی ہے لیکن ایک عام قاری کے لئے اس طشتری میں جو خوان نعمت چنا گیا ہے وہ کشمیر سے متعلق اس کی بڑی حد تک تشفی کرے گا اور اسے کشمیر سے متعلق بعض "بھڑ کے چھتوں" پر تحقیق کے پتھر مارے گئے ہیں۔ اگرچہ یہ پریمی کے طبعی انکسار کی فتح ہے کہ وہ یہ سب کچھ ایسے برجستہ انداز میں کہتا ہے۔ جیسے "کہہ دی کسی نے پیار کی بات"۔ کشمیر کی اسطور اور تاریخ میں اتنی گہرائی ہے کہ اس کے صدف توڑنے میں ابھی نہ معلوم کتنے غوطہ خوروں کی ضرورت پڑے گی اور پھر بھی سچائی کا گوہر آنکھ مچولیاں کرتا رہیگا۔ نظر کے اس گرداب نے تعصب اور تکلف کی کتنی ہی تعبیریں جنم دی ہیں۔ مثلاً سرینگر کے نام میں اس کے پہلے لفظ "سری" کا یار لوگوں نے فتیلہ لگا دیا ہے۔ اور اس کے ڈانڈے سورج دیوتا سے ملا کر سرینگر کو "سورج کا شہر" قرار دیا گیا ہے۔ یہ جاذب نظر فریب جوزف سٹائین جیسے اہل فن آرکیٹکٹ پر بھی چلا ہے جن کا ڈیزائن کیا ہوا سرینگر کا کنونشن کمپلیکس ابھی ابھی کھول دیا گیا ہے اس کمپلیکس کا مرکزی نقطہ سورج کا وہ خاکہ ہے جو اسے سرینگر کے مفروضہ نام سے ملاتا ہے۔

سنگ مرمر سے بنایا ہوا یہ سورنج اچھی تعمیر کاری ہے لیکن اپنی تواریخی روایت میں ایک بے حقیقت اطلاع ہے اور پریمی نے یہی بات کہی ہے۔ دراصل کشمیر کا سب سے بڑا شہر سرینگر تھا۔ اتنا بڑا کہ کشمیر اسی میں ثقافتی طور سما گیا تھا۔ چنانچہ مغل دور میں سرینگر کو ہی کشمیر کہا جاتا تھا۔ سرینگر کا مطلب تھا۔ "THE CITY" یا مقدس شہر۔ جس طرح عرب میں مدینے کو المدینہ کہا جاتا ہے۔ اگر پریمی کے اس اظہار حق سے سٹائین اور اس کو گمراہ کرنے والے دوستوں کی غلط فہمی دور ہو تو اس سے بڑی کامرانی کیا ہوگی۔ پریمی کا بے تعصب اور وسیع نقطہ نظر اس کتاب کے ہر ورق پر آشکارا ہے۔ کشمیر کی تواریخ کی بھول بھلیوں میں بڑے بڑوں کے راستے گم ہوئے ہیں۔ لیکن پریمی نے بڑی احتیاط سے ان خندقوں کو پار کیا ہے۔ وہ شنکر اچاریہ کی پہاڑی کو اس نام کے علاوہ تخت سلیمان کے نام سے بھی یاد کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ دونوں نام اس کے اصل نام کو محو کرکے اختیار کئے گئے تھے۔ یہی بات یہ ہے کہ اگرچہ پریمی نے بڑے بڑے حواشی یا کتاب نامے درج نہیں کئے لیکن یہ کتاب کشمیر کی تواریخ و اسطور کے متعلق بہت ہی کارآمد معلومات بہم پہونچاتی ہے۔ میں قدرے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ اس کتاب کی ورق گردانی ان دوستوں کے لئے ایک مفید مشغلہ ثابت ہوگی۔ جو اپنے آپ کو کشمیریات کے "پہونچے ہوئے" شاستری سمجھتے ہیں۔ اس سلسلے میں وتستا کے اصل منبعے لل دید کے حالات، قدیم کشمیر کا لباس اور رہن سہن سے متعلق مباحث انتہائی معلومات افزا ہیں۔ اس کتاب کے توسط سے میں ایک زخم جگر کا خاص طور ذکر کرنا چاہوں گا۔ اس میں کشمیر کی آبائی گزرگاہوں کا تو بڑا تفصیلی ذکر ہوا ہے۔ لیکن نالہ مار تک آتے آتے فاضل مصنف کا قلم کچھ ٹھٹک سا گیا ہے۔ مار کشمیر کی اسطور اور جمالیات سے وابستہ استعارہ ہے۔ اور یہ شالہ مار کے علاوہ نالہ مار میں بھی موجود ہے۔ اس نالے کے ساتھ نہ معلوم

کتنے خواب پرستوں اور زین العابدین جیسے جہاں پناہوں کے عمل کے دھاگے گندھے ہوئے تھے۔ یہ ہمارے شہر کو ایک پراسرار اور رومان افزا کردار عطا کرتا تھا۔ ایک انوکھا کردار، جیسا وینس کو یورپ میں حاصل ہے۔ لیکن اس امانت کو چند بے خیال اور ناکافی بصیرت وبصارت رکھنے والے لوگوں نے بے دردی سے مٹادیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نالے کو دیرینہ روزی کا روگ لگا تھا لیکن روگ کا علاج کرنے کے لیے جسم کے انگ کو ہی کاٹنا نہ دانش مندی ہے اور نہ ادائیگی فرض اس قسم کے کتنے ہی روگ خود کشمیری قوم کے وجود کو روحانی نالہ مار بنا چکے ہیں لیکن اس کے لئے کشمیری قوم کی اطلاع ضروری ہے نہ کہ اس کا قتل۔ بہر کیف پریمی جیسے ادیبوں جو نالہ مار کے وجود کے آخری شاہد ہیں، کے حوالے سے ہمیں یہ شعر یاد آتا رہے گا ؎

گفتم اے دولتِ جم، جام جہاں بنیت کو
گفت افسوس کہ آں دولت بیدار بہ خفت

میں پریمی کو اس رویے کے لیے بھی بے حد قابل ستائش مانتا ہوں جو اس نے محی الدین فوق کے متعلق اپنایا ہے۔ فوق نے کشمیر کی بیداری کے لئے اپنی عصری مجبوریوں کے جوکھٹے میں رہتے ہوئے جدوجہد کی، وہ ہمارے کسی بڑے سے بڑے دانشور یا سیاسی کارکن نے نہیں کی۔ اس نے کئی کنواری زمینوں میں تحقیق وجانکاری کے پہلے ہل چلائے لیکن اس کے حاسدوں نے ہمیشہ ذاتی اور سیاسی وجوہات کی بناء پر اس کی کردار کشی کی مہم کبھی کھلے بندوں اور کبھی کھسر پھسر کے انداز میں چلائی لیکن یہ ہمارے نئے رویے کی غمازی کرتا ہے۔ جب پریمی لکھتے ہیں:۔

"فوق اپنے عہد کے سب سے قد آور ادیب ہیں۔"

امید ہے کہ یہ نیا انداز نظر ہمیں چھوٹی مصلحتوں کی سطح سے اٹھ کر اپنے مشاہیر اور معاصرین کی زیادہ حقیقت پسند تعین قدر پر آمادہ کر سکے گا۔

یہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں پریمی کی پیش کردہ ہر رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ پریمی کی عالی ظرفی بعض اوقات معروضی حقایق سے پوری طرح نہیں نپٹتی۔ اس سلسلے میں ملک راج صراف کے "رنبیر" سے متعلق اس کی رائے کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ "رنبیر" بنیادی طور پر مہاراجوں کا گزٹ تھا۔ اور ان کی وفاداری کی مہر اپنے ماتھے پر سجائے ہوئے اتراتا پھرتا تھا۔ اس کی ادبی اور صحافتی حیثیت اول سے آخر تک مشکوک رہی اور اگر کسی کو اس میں کلام ہو تو وہ جموں یونیورسٹی میں اس کے پرانے فائل دیکھ کر کر سکتا ہے۔ جہاں سالگرام کول اور محمد الدین فوق مہاراجوں سے اخبار حاصل کرنے کی اجازت حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ وہاں ملک راج صراف نے اپنی سرکار نوازی سے یہ معرکہ جیت لیا۔ اور بعد میں اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ مہاراجوں کی نظر کس قدر قیافہ شناس تھی۔ "رنبیر" کو تواریخی اولیت کے لحاظ سے مقام تو حاصل ہے۔ لیکن کیفیاتی طور پر ایک پن چکی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا جو صرف گندم ڈالنے والی ٹالی کے ارد گرد طواف کرتا ہے پریمی نے کشمیر میں نثر نگاروں کا ذکر کرتے ہوئے مولوی عبداللہ وکیل اور پریم ناتھ بزاز کا "رنبیر" سے رشتہ جوڑ دیا ہے۔ جو ثبوت کا محتاج ہے۔ سچی بات ہے کہ اس سے زیادہ کشمیر میں اردو نثر و نظم کا شوق اجاگر کرنے میں اس سے بیس سال پہلے شایع ہونے والے لاہور کے ہفتہ وار "اخبار کشمیری" نے ادا کیا۔ ایسا کہنا اس لئے ضروری ہے کہ سونے اور پیتل کو ایک پلڑے میں نہ تولا جاتا رہے اور تاجرانہ منصوبہ بندی سے سینچے اور الفاظ سے پالے ہوئے مفروضوں کی اصل صورت واضح ہو۔ اس کتاب کا ایک نہایت اہم مضمون رام چندر بالی اور آرل سٹائین کے خطوط سے متعلق ہے۔

یہ اس عظیم خاورشناس اور کشمیر نواز کی زندگی کا ایک نرالا زاویہ نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔ اس کی شاندار علمی اور تحقیقاتی مہمات سے ہم سب واقف ہیں۔ اپنی علمی پروازیں کبھی کبھی اس کی رفتار اتنی تیز اور اونچی ہو جاتی ہے کہ اس کی انسانی حیثیت کے بارے میں سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملتا۔ رام چندر بالی کے نام خطوط میں وہ ایک دلنواز اور درد مند انسان کی حیثیت سے نظر آتا ہے اور یہ اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کشمیر سے اس کی وابستگی کتنی گہری تھی۔ افسوس ہے کہ حالات نے کشمیر میں دفن ہونے کی اس کی خواہش پوری نہیں ہونے دی لیکن اس کی ناتمام آرزوؤں نے کشمیریوں پر اس کا ایک قرض چھوڑا ہے جو آج چالیس سال بعد بھی واجب الادا ہے۔ شٹاین کے نام پر قدیم کشمیر کے مطالعات کا ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کرنا اس کا منطقی جواب ہے۔ حیرت ہے کہ کسی کو آج تک کشمیر میں شٹاین کے تعلق سے ایک سیلنے کا سیمنار منعقد کرنے کی بھی نہیں سوجھی۔

میں پیر پرمی کی اس کتاب کی کشمیریات سے متعلق عام قاری کے لئے اہمیت پر زور دینا چاہتا ہوں۔ مجھے فوق کے بعد اردو میں اس قسم کی ایک کتاب کا علم ہے۔ اور وہ ہے مظفر آباد کے ڈاکٹر صابر آفاقی کی تصنیف "جلوۂ کشمیر"۔ پرمی کا طرز بیان دل کش ہے اور اس نے کشمیر کی تواریخ کے ہزارہا صفحات کو چھان کر چند کیپسول (CAPSUL) قسم کی معلومات اس طرح ابھاری ہیں کہ کشمیر اور اس کے لوگوں کے تواریخی اور تمدنی سفر کے نت نئے رگوشے روشن ہو جاتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب اپنی مقبولیت سے اپنا جواز ثابت کرے گی۔

سری نگر ۱۲۔ اپریل ۱۹۸۴ء

—— محمد یوسف ٹینگ

میری بات

یہاں میں رہتا ہوں

● جہاں میں رہتا ہوں اسے صدیوں سے دھرتی کا سورگ کہا جاتا ہے۔ الپسراؤں کا یہ دیس تہذیب کی صبح سے اپنے ملکوتی حسن، اپنے رنگ اور اپنے نور سے سورگ کے انسانی تصور کا پیکر ہے یہ وہ خطۂ ارضی ہے جہاں کے صد رنگ جلوؤں نے صدیوں سے سیلانیوں کو برمایا ہے۔ یہاں گیان دھرفان کے کتنے سوتے پھوٹے ہیں، آگہی و بصیرت کے کتنے چراغ روشن ہوئے ہیں اور عقل و عشق کے کتنے مرحلے انجام کو پہنچے ہیں۔ —— تاریخ کے اوراق پر یہ سب داستانیں منقش ہیں۔

● جہاں میں رہتا ہوں، وہاں کی صبحوں اور شاموں پر بنارس کی صبحیں اور اودھ کی شامیں قربان ہیں۔ یہاں کی ہر سحر یہاں کی سحر ہے اور یہاں کی ہر شام یہاں کی شام ہے ان صبحوں اور شاموں کی ہر شبیہ اور ہر رنگ بے مثال ہے۔ اس کی ہمسری کا یارا کسی اور شبیہ، کسی اور رنگ میں نہیں۔ یہ سرزمین شاعر کا تخیل ہے اور مغنی کا سانہ،

یہ حُسن پرستوں کی عبادت گاہ ہے اور عقل و جذبے کی آماجگاہ۔ یہاں قدرت اپنی تمام حشر سامانی بے نقاب کرتی ہے اور انسانی عقل جودتِ ذہن کے جلوے بکھیرتی ہے۔ ستی سر کے نیلے پانیوں کے "جلال" سے لے کر آج تک اس سورگ بھومی کے پپوٹوں پر کتنے خواب بیدار ہوئے ہیں۔ یہاں بودھوں نے ازلی حسن کی تلاش کی۔ ہندو شو کو کھوجتے رہے، مسلمان توحید کے یقین سے دلوں کو روشن کرتے رہے اور عیسائی انجیل کی مقدس آیات سے اپنے باطن کے چراغ جلاتے رہے — یہاں کتنی قومیں آئیں اور نیست و نابود ہو گئیں۔ ہماری میراث یہ سارے نقوش ہیں۔

● جہاں میں رہتا ہوں، وہ وتستا کا شہر ہے۔ جو پاروتی کا دوسرا پیکر ہے جسے شو نے پاتال کی گہرائیوں سے باہر کھنگال لیا تھا کہ پانیوں کے پاپ دھل جائیں —
یہ کشپ ریشی کی تپسیا ہے۔ یہ لل دید اور شیخ العالم کا عرفان ہے۔ یہاں حبہ خاتون، رسول میر پرمانند اور مہجور کے نغمے گونجے ہیں جن میں چنار کے شتیل سایوں کی سانسیں مہکتی ہیں اور حسن و عشق کی تمام صباحتیں اور تمام رعنائیاں رسمساتی ہیں یہ ان عطر بیز ہواؤں کا مسکن ہے جو وولر، مانسبل اور کونسر ناگ کے پانیوں سے سرسراتی ہوئی اٹھتی ہیں۔ یہ گلمرگ، توسہ میدان اور سونہ مرگ کی خواب آگیں خوشبوؤں کی سرزمین ہے۔ یہاں کی فضاؤں میں امرناتھ کا تقدس اور حضرت بل کا نور ہے۔ یہ گوپادری اور تخت سلیمان، ہاری پربت اور کوہ ماراں خانقاہ شاہ ہمدان اور کالی شری کا مسکن ہے۔ یہ ناگ ارجن بھاسکر آچاریہ، ابھنوگپت اور شیخ یعقوب صرفی کی آماجگاہ ہے۔
یہ برنیر، رچرڈ ٹمپل، رابرٹ تھارپ، لارنس، سٹائین، لبکو اور ایسے ہی کتنے عاشقوں کا محبوب ہے۔
یہ جواہر لال اقبال، چکبست اور سعادت حسن منٹو کا عشق ہے۔
یہ فن کاروں، شاعروں، عابدوں، پرہیزگاروں اور حسین دل و دماغ رکھنے والوں

کا وطن ہے۔ یہ جموں اور لداخ کا دل ہے اور بھارت ماتا کے ماتھے کی بندیا۔

یہ سرزمین صدیوں کی غلام در غلام، استحصال کی چکی میں پسی ہوئی بے بسی کی نیندوں میں اونگھتی ہوئی رہی ہے۔ یہاں کے حسن کو بوالہوسی کی بھٹیوں میں خاکستر کیا گیا ہے قدرت کے خزانے سے عطا ہوئی دولت کو جاگیردارانہ نظام کے ہر دور میں بھر بھر کر لوٹا گیا۔ یہاں کے ذہن رسا عقل و دل گیان و عرفان، علم و فن کو غلامی کی شمشیر نے ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ نسل در نسل غلامی کے حصاروں نے ذہنوں کو مفلس اور روح کو مقید کر کے بے بس اور لاچار بنا دیا۔ یہاں کی معصوم اور بے ریا مہمان نوازیوں نے جاگیردارانہ اور چیک دارانہ نظام کے ناز و ادا کو سہہ لیا۔ یہ ماضی کے گھاؤ ہیں جو برس ہا برس تک رستے رہے ہیں جن کی یادیں اب بھی کبھی کبھی دل کے دریچوں میں لرزش پیدا کرتی ہیں اور سہمی سہمی نگاہیں بند ہو جاتی ہیں۔ لیکن بیداری اور آزادی کی چنگاری ہر عہد میں دہکتی رہی ہے۔ اسی دہکتی ہوئی جوالا نے شیر کشمیر کو پیدا کیا۔

میں صدیوں سے اس سرزمین میں رہتا چلا آیا ہوں۔ میں اس کا انگ انگ اور روم روم ہوں۔ میری رگ رگ میں یہی عطر بیز ہوائیں، یہی تقدس و طہارت قدرت کی مہانتا کے یہی رنگ کیسر کی کیاریوں کا یہی سہاگ، علم و فن اور عقل و دل کی یہی خوشبو ہے۔ مجھے ازل سے ان پراسرار سناٹوں کو سمجھنے کی تلاش ہے جو یہاں کے ہر پربت ہر جنگل، ہر جھیل، ہر پھول اور نیلے آکاش پر آہستہ خرامی سے اڑتے ہوئے سہر بادل میں محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے اس مجموعے میں شامل اپنی الٹی سیدھی تحریروں میں ان سحر سامانیوں کو تھامنے کی کوشش کی ہے۔ ان سحر سامان سناٹوں کے اس قدر رنگ ہیں کہ میرے الفاظ میں یارا نہیں کہ ان سبھی رنگوں کو سمیٹ سکوں۔ یہ ایک چھلاوے کی طرح اڑ کر فضاؤں میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اور میں حیران اور مبہوت خلاؤں کی پنہائیوں میں صرف تکتا رہ جاتا ہوں۔

یہ رنگ میرے وجود کا حصہ ہیں!

یہ میں ہوں ___ میرا ریزہ ریزہ وجود!

اگر آپ کو ان رنگوں میں کہیں، کسی جگہ میرا لرزتا ہوا وجود ملے تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہوا ہوں۔

یہی میرا انعام ہے، یہی میرا صلہ!

● یہ مضامین اس طویل سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس پر میں کچھ عرصہ سے کام کر رہا ہوں۔ میری تمنا ہے کہ میں آئندہ بھی اس سلسلے کے مضامین شایع کر دوں جن میں کشمیر کے ادب، یہاں کی ثقافت، یہاں کے عرفان اور یہاں کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں کو پیش کروں۔ میں اپنے قارئین کے زریں مشوروں کا منتظر رہوں گا۔

ٹیچرس کوارٹرس، یونیورسٹی کیمپس
امرسنگھ باغ حضرت بل، سرینگر کشمیر

برج پریمی
۵۔ اگست ۱۹۸۴ء

دوسری بات (طبع ثانی)

جلوہ صد رنگ کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۵ء میں شایع ہوا تھا۔ میرے لئے یہ کیا کم افتخار ہے کہ لوگوں نے اس کے مطالعے کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کا یہ ایڈیشن بہت ہی قلیل عرصے میں ختم ہو گیا۔ اہل نظر حضرات نے مجھے اپنی گراں قدر آرا سے نوازا اور مفید مشورے دیئے جن سے مجھے حوصلہ ملا۔ ریاستی کلچرل اکادمی نے اسے سال ۱۹۸۶ء کے پہلے گراں قدر انعام سے نوازا۔ اس ادب پروری اور حوصلہ افزائی کے لئے میں اکادمی کا سپاس گزار ہوں۔ اس ایڈیشن میں معمولی رد و بدل کر کے ان کوتاہیوں کو دور کرنے کی سعی کی گئی ہے جو پہلے ایڈیشن میں رہ گئی تھیں۔

۱۰۔ یونیورسٹی کیمپس
امرسنگھ باغ حضرت بل، سرینگر

برج پریمی
۱۔ اگست ۱۹۸۹

کشمیر۔ غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں

"حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سلطنت (کشمیر) حسن و جمال
کی ان تمام جلوہ سامانیوں سے بہت بلند اور بہت
بالا ہے جس کا میں نے کبھی تصور بھی کیا ہو"

(فرانسس برنیر ۱۶۶۵ء)

کشمیر کے حسن و جمال کے جلوۂ صد رنگ کی حشر سامانی تہذیب اور شعور کی صبح سے مشک عنبریں کی طرح مہکتی رہی ہے۔ اس حُسن کی خوشبو نے زمانہ قدیم سے سیلانیوں کو برمایا ہے اور رسل و رسائل کے محدود وسائل کے باوجود یہاں آکر گھومنے اور یہاں کے نظر نواز جلوؤں میں مجذوب ہونے پر اکسایا ان سیلانیوں کے ذوق و تجسس کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ لوگ ہماری قدیم داستانوں کے باہمت اور اولوالعزم اور مشکل پسند کرداروں سے کم نہیں تھے جن کا مقابلہ اگرچہ جنوں، پریوں اور عجیب المخلوق خلقت

سے نہیں تھا لیکن جن کی مہمات کوہ و قاف کے جان لیوا سفر سے کم نہیں تھیں۔ ان سیلانیوں کو بھی عجیب و غریب جنگلوں کے سناٹوں میں سے گزرتے ہوئے کئی ہیفت خواں طے کرنا پڑے برفانی پربتوں کی دشوار گزار چوٹیوں، میلوں تک پھیلی ہوئی سرسبز مرگوں "تند اور تیز برفانی ہواؤں کی آندھیوں اور بے نام نقرئی نغموں کی سرسراہٹوں کے تعاقب کی سہما دینے والی کیفیات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب آدمی پر میٹھی نیند کا جال تن جاتا ہے۔ آنکھوں کے پپوٹوں پر رقص کرتی ہوئی یہ نیندیں بارہا ان کو موت کی دہلیز پر گھسیٹتی ہوئی لے گئی ہیں لیکن پھر، انہوں نے موت کی اس چال کو سمجھ کر اسے جھٹک دیا ہے۔ انہوں نے کھلی آنکھوں سے قدرت کے ان بکھرے ہوئے جلووں کو دیکھا جو غم اور ملال کے زہر پر تریاق رکھ دیتا ہے۔ انہوں نے اس خوبصورتی کے سائے میں پلنے والی نحوست اور بدصورتی کا بھی نظارہ کیا جو انسانی ہاتھوں نے پیدا کیا ہے۔ ان خوشبوؤں کے ساتھ اس بدبو کو بھی سونگھا جس نے یہاں صدیوں کی غلام در غلام زندگی کو اپنی لپیٹ میں لیا تھا اور اس کے ماتھے پر بدبختی کی افشاں ڈال دی تھی لیکن روح کے دریچوں پر دستک دینے کی ہمت کسیوں میں کہاں ہوتی ہے؟ قدرت کے جلووں کی حشر سامانی کا نظارہ کرنے کے لیے چشم بینا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے بعض اوقات جلوے سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں لیکن ــــ

...... لیکن جب بادل بکھر گئے ہوں، کہراہٹ گیا ہو اور
کشمیر کی حقیقی بہار یا خزاں نے اپنے اسرار کھول دیئے ہوں
تب ایک سخت سے سخت جان سیاح کا دل بھی پگھل
جاتا ہے۔ اور وہ بربریز بن جاتا ہے۔" ۱ـ

غیر ممالک سے اس وادی رنگ و بو میں باہر کے سیلانیوں کی آمد کا سلسلہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اہم سیاحوں میں ہیون سانگ کا نام سرفہرست ہے جو ساتویں صدی عیسوی

۱ـ FRANCIS YOUNG HUSBAND: KASHMIR P.156

(۶۳۱ء) میں وادی میں داخل ہوا۔ دوسرا چینی سیاح او کانگ تھا جو ۷۵۹ء میں کشمیر آیا اور چار سال یہاں مقیم رہا۔ عیسائی مبلغ فادر جیروم زیویر، بنولیسٹ ڈی گیسوس اور فرانسس زیویر ابتدائی یورپی سیاح تھے۔ جنہوں نے ۱۵۷۲ء کے قریب کشمیر کی سیاحت کی۔ یہ مشنری اکبر اعظم کے ساتھ کشمیر آئے۔ فرانسیسی معالج فرانسس برنیر اورنگ زیب کے عہد حکومت میں شہنشاہ کے ساتھ ۱۶۶۵ء میں کشمیر آیا۔ بنگالی افواج کا اعلیٰ افسر جارج فارسٹر سینٹ پیٹرس برگ (روس) واپس لوٹتے ہوئے ۱۷۸۳ء میں وادی میں داخل ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ویٹرنری سرجن ولیم مور کرافٹ ۱۸۱۹ء کے آس پاس اپنے طویل دورے پر روانہ ہوا تو اس نے بھی کشمیر میں قیام کیا۔ اسی طرح انیسویں صدی کے دوران مختلف وقفوں کے بعد بیرن چارلس ہیوگل، سر رچرڈ ٹمپل، والٹر لارنس، الیگزانڈر کننگھم، ینگ ہسبنڈ، بوہلر، ارل سٹین اور ایسے ہی کتنے مورخ، جغرافیہ داں، فوجی افسر، عالم، زبان داں اور سب سے بڑھ کر سیلانی اس خاکِ دامن گیر کے حسن و جمال کی شادابیوں سے محظوظ ہونے کے لئے چلے آئے اور اپنے اپنے تاثرات کو سفرناموں، ڈائریوں اور کتابوں کی صورت میں محفوظ کیا۔ سال ہا سال کے کینوس پر پھیلی ہوئی اس روداد کو سمیٹنے کا یہاں محل نہیں۔ ہم صرف چند سیاحوں کے تاثرات میں سے چند اقتباسات پیش کریں گے جو نہ صرف انکے ذوقِ نظر پر دال ہیں بلکہ یہاں کی زندگی کے بعض اہم گوشوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔

ہیون سانگ

عظیم چینی سیاح اور بودھ عالم ۶۰۲ء میں چین ـــــ کے صوبے میں چن لن کے مقام پر پیدا ہوا۔ بیس سال کی عمر میں اسے ایک بودھ بھکشو کا منصب عطا ہوا۔ بودھ تعلیمات سے پوری جانکاری حاصل کرنے کی تمنا نے اسے چانگان پہنچا دیا۔ یہاں پہلی بار اسے نا بیان اور جی یان کی یاداشتوں کو دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہیں اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے ذہن

میں اٹھے ہوئے پیچ در پیچ سوالات کی گتھیوں کو سلجھانے کے لیے وہ مغربی علاقوں کی سیاحت اختیار کرے۔ ہیون سانگ پورے سولہ سال ۶۲۹ء سے ۶۴۵ء تک اپنے ملک سے باہر رہا۔ اس دوران اس نے دوسرے ممالک کے علاوہ ہندوستان کی سیاحت کی۔ ہیون سانگ ۶۳۱ء میں مغرب کے راستے اوسکر سے کشمیر میں داخل ہوا۔ اور یہاں دو سال قیام کے بعد ۶۳۳ء میں توسہ میدان کے راستے واپس لوٹا۔ ہندوستان اور کشمیر کے قیام کے دوران وہ سنسکرت اور بودھ دھرم کی کتابیں تلاش کرتا رہا۔ وہ نہایت ہی صحت کے ساتھ ان راستوں اور گزرگاہوں کو بیان کرتا ہے، جہاں سے وہ گزرا تھا۔ اس نے بودھ وہاروں اور بودھ ستوپا کا بھی ذکر کیا ہے اور راجا اور (پرجا) رعایا کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔

ہیون سانگ نے کشمیر کی جغرافیائی حدود کا ذکر کیا ہے۔ مروجہ روایات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے اور وادی کے آغاز کے بارے میں بھی معلومات درج کی ہیں۔ ہیون سانگ دو سال کشمیر میں رہا وہ "جنیندر وہار"[1] نام کی بودھ خانقاہ میں مقیم رہا۔ یہ خانقاہ پرورسین دوم کے ماموں جنیندر نے تعمیر کروائی تھی۔ اور موجودہ سرینگر میں واقع تھی۔ ہیون سانگ نے اپنے سفر کا مفصل حال اپنی کتاب SI-YU-KI میں درج کیا ہے۔ وہ اپنی یادداشتوں میں کشمیر کو کشمیلو (KI-SHI-MI-LO) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:

۱۔ "کشمیر کی سلطنت اپنے حدود (حلقے) میں سات ہزار لی ہے یہ ملک چاروں طرف پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ پہاڑ بلند و بالا ہیں۔ اگرچہ پہاڑوں میں درے موجود ہیں لیکن یہ نہایت تنگ و تاریک ہیں۔ پڑوسی

---

[1] ALEXANDER CUNNINGHAM: THE ANCIENT GEOGRAPHY OF KASHMIR P-82

ممالک جنہوں نے اس ملک کو اکثر و بیشتر اپنی یلغار کا نشانہ بنایا ہے۔ اسے کبھی پامال کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ملک کی راجدھانی مغربی اطراف میں ہے۔ اس کی حدود پر ایک بڑا دریا بہتا ہے۔ یہ راجدھانی شمال سے جنوب کی طرف ۱۲ یا ۱۳ لی اور مشرق سے مغرب کی طرف ۴ یا ۵ لی پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کی سرزمین بادام اور دوسرے پھل پھول اگانے کے لئے زرخیز ہے۔ یہاں اژدہے، گھوڑے اور خوشبودار ہلدی کے پودے ہیں جن کو فوچیوں FO-HI کہتے ہیں اس کے علاوہ دوسرے ادویاتی پودے بھی اگتے ہیں"۔ لہ

۲۔ "ہوا سرد اور خنک ہے کافی برف باری ہوتی ہے مگر ہوائیں کم چلتی ہیں۔ لوگ چمڑے کی صدری پہنتے ہیں اور سفید لینن کے ملبوسات استعمال کرتے ہیں۔ لوگ غیر سنجیدہ، کمزور اور ڈرپوک ہیں۔ چونکہ یہ ملک اژدہے (دیومالائی) کے باعث محفوظ ہے۔ اس لیے اسے پڑوسی ممالک کے لوگوں پر برتری حاصل ہے لوگ خوبرو لیکن ریاکار ہیں۔ یہ علم و فضل سے آراستہ ہیں۔ یہاں ملحد بھی رہتے ہیں اور خدا پرست

لہ SI-YU-KI-BY HIUN TSIONS- TRANSLATED BY SAMUEL, BEAL P-148

بھی۔ یہاں کئی سنگھارام اور پانچ ہزار بھکشو ہیں۔ اشوک نے چار ستوپا بھی تعمیر کروائے ہیں.....‘‘[1]

فرانسس برنیر

فرانسس برنیر ایک فرانسیسی معالج تھا۔ وہ اورنگ زیب کے عہد میں ہندوستان آیا اور شہنشاہ اور شاہی قافلے کے ساتھ ۱۶۶۵ میں کشمیر میں داخل ہوا۔ برنیر نے مغل عہد کے کشمیر کے حالات اپنے مشہور خطوط میں قلمبند کئے ہیں۔ وہ پوری تفصیل کے ساتھ دہلی سے کشمیر آنے جانے والے راستوں اور گزرگاہوں کو بیان کرتا ہے۔ اس نے اس عہد کے کشمیر کی اقتصادی اور سماجی زندگی پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور بڑے خلوص کے ساتھ اپنے ان جذبات کا اظہار کیا ہے۔ جو کشمیر کے حسن کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوئے تھے۔ اس نے کہا تھا:

’’حقیقت تو یہ ہے کہ یہ سلطنت حسن و جمال کی ان تمام
جلوہ سامانیوں سے بہت بلند اور بہت بالا ہے
جس کا میں نے کبھی تصور بھی کیا ہو۔‘‘

کشمیر کے حسن لازوال کی حشر سامانیوں کا ذکر کرتے ہوئے وہ شاعر بنتا ہے لیکن جب یہاں کے ذہن، یہاں کی ہنرمندی اور صناعی کا ذکر آتا ہے تو اس کی باریکیوں کو بیان کرتا ہے اور فن کاروں کو داد دیتا ہے جو اپنی روح کا درد اور آنکھوں کی بینائی ان شاہکاروں میں ڈھالتے ہیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

’’کشمیری اپنی ذکاوت کے لئے مشہور ہیں۔ یہ لوگ
ہندوستان کے لوگوں سے زیادہ ذہین سمجھے جاتے
ہیں۔ شعر و شاعری اور سائنسی علوم میں یہ ایرانیوں

---

[1] SI-YU-KI-BY HIUN TSIANG. TRANSLATED BY SAMUEL BEAL PAGE 148.

سے کچھ کم نہیں ہیں۔ یہ بڑے ہوشیار اور محنتی لوگ ہیں۔ ان کی کاریگری کا احساس ان پالکیوں، پلنگوں، قلمدانوں، صندوقوں، چمچوں اور دوسری ایسی چیزوں سے ہوتا ہے جو یہ لوگ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں۔ یہ بڑی شاندار چیزیں ہیں اور ہندوستان کے طول و عرض میں ان کا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جس چیز سے ان ملکوں کی تجارت بڑھ جاتی ہے اور جس سے وہ مالا مال ہوتے ہیں وہ ایسے گراں قدر شال ہیں جو وہ اپنے ہاتھ سے بناتے ہیں اور اپنے چھوٹے بچوں کا پیٹ بھرتے ہیں۔"[1]

ولیم مورکرافٹ

مورکرافٹ لنکاشائیر کا رہنے والا تھا۔ لورپول میں سرجری کی تعلیم پائی۔ اس کے بعد لندن میں مستقل طور اقامت پذیر ہوا۔ اور ویٹرنری سرجری کو اپنا پیشہ بنایا۔ ۱۸۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت کے سلسلے میں انگلستان سے ہندوستان کا سفر اختیار کیا۔ بنگال میں فوج کے اصطبل کے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ کمپنی کے گھوڑوں کی حالت غیر تسلی بخش پاکر گھوڑوں کی نسل کو بہتر بنانے کے لئے مورکرافٹ نے یہ تجویز کیا کہ ترکمانی یا انگریزی گھوڑوں کو عربی گھوڑوں پر ترجیح دی جائے۔ ابتداء میں اس کی تجویز قبول کی گئی۔ لیکن بعد میں بلخ اور بخارا کے گھوڑوں پر قرعہ فال پڑا۔ یہی سبب مورکرافٹ کی لمبی سیاحت کا محرک ثابت ہوا۔ مورکرافٹ نے اپنی سیاحت کا آغاز ۱۸۱۹ء کے اواخر میں کیا۔ وہ کمیؤ ہمالیائی خطوں میں گھومتا اور بڑے خلوص اور لگن سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ ایسے ہی ایک سفر میں وہ شدید بخار میں مبتلا ہوا۔ جو اس کی موت کا سبب بن گیا۔

---

[1] P.N.K BAMZAI: A HISTORY OF KASHMIR P. 602

اپنی اس سیاحت کے دوران مورکرافٹ کشمیر بھی پہنچا اور یہاں قیام کیا یہ کشمیر میں سکھ دور تھا۔ مورکرافٹ نے دو جلدوں میں ایک مفصل سفرنامہ تحریر کیا ہے دوسری تفصیلات سے قطع نظر اس نے کشمیریوں کی زندگی، ان کے حفظانِ صحت، ان کے افلاس اور ان کے درد و غم کی روداد بڑی جگر کاوی سے اپنے سفرنامے میں درج کی ہے۔ مورکرافٹ کا سفرنامہ ایک بے ریا، مخلص اور ایک بڑے حد کشادہ دل انگریز کا سفرنامہ ہے۔ اس نے کشمیر میں کیا دیکھا اور کیا پایا' اس کا ایک سرسری اندازہ ذیل کے اقتباسات سے ہوتا ہے :-

۱۔ "کشمیر کے شہر کا عام کردار ایک دوسرے پر گری پڑی عمارتوں سے ظاہر ہوتا ہے جو تنگ و تاریک اور غلاظت سے بھری ہوئی پیچ در پیچ گلیوں کی بھول بھلیوں کو متشکل کرتی ہیں گلیاں اس قدر تنگ ہیں کہ ان کے بیچوں بیچ گندی نالی بہتی ہے جس کے ہر طرف دلدل کا ایک حاشیہ ہے مکان عام طور سے دو یا تین منزلہ ہیں جو بے جلی اینٹوں اور عمارتی لکڑی سے بنی ہوئی ہیں۔ بری طرح کھڑی کی گئی یہ عمارتیں پلاسٹر سے محروم ہیں۔ دروازے ٹوٹے ہوئے ہیں یا بالکل ہی نہیں ہیں۔ کھڑکیوں پر کاغذ یا چیتھڑے لگے ہوئے ہیں اور چھت ایسے ہیں کہ اب گرے کہ اب گرے۔" [1]

سکھ عہد کے مظالم کے پس منظر میں عوام کی بدحالی ملاحظہ ہو۔

۲۔ "...... لیکن لوگ ہر جگہ بہت ہی بری حالت میں ہیں سکھ حکمرانوں نے ان پر ٹیکسوں کی بھرمار کر دی ہے۔

۱۔ WILLIAM MOORCRAFT: TRAVELS IN HIMALAYAN PROVINCES OF HINDUSTAN P. 119

ان کے افسران ہر قسم کے مظالم ڈھاتے ہیں۔ اس نظام کے ظلم وستم کا نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں آبادی روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ پوری قابل کاشت زمین کا سولہواں حصہ کاشت کیا جاتا ہے۔ آبادی کا بیشتر حصہ اپنے گھروں میں بھوکوں مر رہا ہے یہی وجہ ہے کہ لوگ بڑی تعداد میں ہندوستان کے میدانی علاقوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں۔ اور شہر کی آبادی اس ہجرت سے نہیں بلکہ بیماری اور غربت کے باعث تیزی سے کم ہوتی جارہی ہے۔ [۱]

۳۔ "ایک وقت میری فہرست میں چھ ہزار آٹھ سو مریض تھے جن میں سے اکثر بہت سے لوگ مکروہ بیماریوں کے شکار تھے۔ ایسی بیماریاں جو ناکافی خوراک، تاریک اور سیل آلود مکانوں، میل کچیل اور بدکاری کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔" [۲]

۴۔ "کشمیریوں کا ہمیشہ ایشیا کے زندہ دل اور ہنرمند لوگوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے، اور وہ اس کے مستحق ہیں۔ اگر انہیں آزاد خیال اور دانشمند حکومت ملے تو وہ اخلاق مند اور عقلمند لوگوں میں اونچا درجہ پائیں گے۔ لیکن موجودہ حالت میں ان سے زیادہ پست کوئی اور قوم نہیں۔" [۳]

۵۔ "میرا خیال ہے کشمیریوں کی اخلاقی برائیاں یہاں کے سیاسی حالات کی وجہ سے ہیں ان کے مزاج کے باعث

۱، ۲، ۳ WILLIAM MOORCRAFT: TRAVEL IN HIMALAYAN PROVINCES OF HINDUSTAN. P. 124, 124, 128.

نہیں۔ ان کے رویے میں تبدیلی لانا مشکل نہیں ہوگا ان کے مزاج میں مذہبی تعصب نہیں ہے۔ دونوں فرقوں کے رہنما ملایا پنڈت جاہل ہیں اور ان کا لوگوں پر کوئی اثر نہیں"۔ ؎۱

سر الیگزانڈر کننگھم

سر الیگزانڈر کننگھم ہندوستان میں آثار قدیمہ کی کھوج کا اولین معمار سمجھا جاتا ہے وہ پیشے کے لحاظ سے ایک فوجی افسر تھا۔ لیکن اس کی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک انجنیئر، ایک جغرافیہ دان، ایک مورخ اور سب سے بڑھ کر آثار قدیمہ کا بہت بڑا ماہر تھا اور یہ مہارت اس نے کافی جگر کاوی اور ریاضت سے حاصل کر لی تھی۔ کننگھم کی آثار قدیمہ سے دل چسپی کا باعث ۱۸۴۷ء میں اس کی سیاحت کشمیر تھی۔ یہاں کے مندروں کے فن تعمیر سے وہ بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس موضوع پر کننگھم کی کتاب بہت اہم ہے۔ اس کے کارناموں میں ہندوستان کا قدیم جغرافیہ، لداخ، ہندوستان کے قدیم سکے از منہ وسطیٰ کے ہندوستانی سکے اور دوسری متعدد کتابیں ہیں جو کننگھم کی دل چسپی کے رنگارنگ موضوعات کی آئینہ داری کرتے ہیں۔

کننگھم ہیون سانگ کے ذوق تجسس کی تعریف کرتا ہے اور اگرچہ اس کے اکثر بیانات کو صحیح تصور کرتا ہے پھر بھی کہیں کہیں اس سے اختلاف بھی کرتا ہے۔ ہیون سانگ کے عہد کے جغرافیائی حدود کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"ہیون سانگ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے اسے چاروں

؎۱ WILLIAM MOORCRAFT: TRAVELS IN HIMALAYAN PROVINCES OF HINDUSTAN P.No: 129

طرف بڑے بڑے پہاڑوں سے گھرا ہوا بیان کرتا ہے، جو وادی سے متعلق ایک صحیح بیان ہے مگر جب وہ کہتا ہے کہ اس کا حلقہ سات ہزار لی یا ۱۶۶ میل ہے تو بات نہیں بنتی اسے کشمیر کی سلطنت کی توسیعی سرحدوں کا ذکر کرنا چاہئے تھا نہ کہ صرف وادی کا جو صرف اپنے حلقے میں تین سو میل ہے کشمیر اپنی سیاسی حدود کے علاوہ شمال سے سندھ اور جنوب میں راوی تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ فاصلہ نو سو میل سے کم نہیں ہو سکتا اور شاید یاتری سیاح کے بتائے ہوئے اندازے تک پہنچا ہوگا۔" ۱

مہاتما بدھ کے متبرک اور مقدس دانت کا ذکر یوں ہوتا ہے کہ اس دور کے مذہبی رجحانات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔:

"پرانی راجدھانی کے قریب ایک مشہور ستوپا تھا جس میں ۶۳۱ء میں مہاتما بدھ کا ایک مقدس دانت تبرک کے طور پر موجود تھا۔ لیکن ہیون سانگ کے پنجاب واپس لوٹنے سے قبل ۶۴۳ء میں یہ مقدس دانت راجہ نے ہرش وردھن کو دیا تھا جو قنوج کا طاقتور بادشاہ تھا اور جو کشمیر کی سرحدوں پر ایک جرار لشکر لے کر آدھمکا تھا۔ چونکہ راجہ دھرلبھ ایک برہمن تھا اس لئے

---

۱ CUNNIGHAM : THE ANCIENT GEOGRAPHY OF KASHMIR . P.NO 76- 79.

گوتم بدھ کے مقدس دلنت سے محرومی اس کے مذہبی
مقاصد کے لئے سود مند تھا۔"[1]

علم جغرافیہ سے کننگھم کی دلچسپی اس کے بیانات سے بار بار ظاہر ہوتی ہے۔ کشمیر کے قدیم شہروں کا نہ صرف اس نے ذکر کیا ہے بلکہ ان کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہ بیان دلچسپی سے خالی نہیں؛

"کشمیر کے قدیم بڑے شہر یہ ہیں، سرینگر کی پرانی راجدھانی
نئی راجدھانی، پرورسین پور، کھاگندر پور اور کھنموشہ
(جو اشوک کے عہد سے پہلے آباد ہوئے تھے) وجی پور
اور پانتہ چھوک (یہ شہر اشوک سے منسوب ہیں)
ہُراپور، کنشک پور، ہشک پور، جُشک پور (ہندی سیتھی
شہزادوں سے منسوب) للتادیتہ کے تعمیر کئے ہوئے
شہر پر ہاس پور، پدم پور جو راجہ برہستی کے وزیر پدم
کے نام پر تعمیر ہوا تھا اور راجہ اونتی ورمن کا اونتی پور"[2]

بیرن چارلس ہیوگل

چارلس ہیوگل نے مہاراجہ رنجیت سنگھ والیٔ پنجاب کے دورِ حکومت میں کشمیر کی سیاحت کی۔ کشمیر میں افغان حکومت ختم ہو چکی تھی اور سکھ عہد کا آغاز ہو چکا تھا۔ اگرچہ یہ دور بھی کشمیریوں کے لئے اطمینان کا دور نہیں تھا، تاہم افغان دور کے مظالم سے چھٹکارا پاکر عوام نے سکون سے رہنا شروع کیا تھا لیکن ابھی عوام کے معیار

ل CANNIGHAM: THE ANCIENT GEOGRAPHY OF KASHMIR P.79-76

۲ " " " " " " P.80

زندگی میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا تھا۔ غلامی کی زندگی بدستور قایم تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ آقا بدل گئے تھے۔ ہیوگل نے بڑی تفصیل کے ساتھ اپنی سیاحت کی روداد قلمبند کی ہے۔ دوسرے سیلانیوں کی طرح اس کا دل بھی یہاں کے دل فریب مناظر دیکھ کر مچل اٹھتا ہے اور اپنے حسنِ بیان سے اپنے تاثرات کاغذ پر اتارتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ اپنے منصب سے بھی عہدہ برآ ہوتا ہے اور تمام جغرافیائی اور تواریخی باریک بینی کے ساتھ ان مقامات کی تفصیل پیش کرتا ہے۔ جہاں جہاں وہ گھوما ہے۔ چند اقتباسات جن میں شاعرانہ تخیل کی کارفرمائیاں نظر آتی ہیں ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ "اپنے پہلے دن کے قیام میں میں نے کشمیر میں صرف کھنڈرات دیکھے۔ کھنڈرات —— جو پہلے کبھی محل رہ چکے ہوں گے۔ سڑکوں کی غلاظت اور کثافت اللہ کی پناہ!...... ایک بڑی کشتی میں مچھیرنیں بیٹھی تھیں۔ ان کی بے ہنگم آواز سے میں مبہوت ہو گیا۔ یہ "درنہ وَلُن" کی لے تھی جو باہر نالے سے آ رہی تھی۔ اور یہ میرا پہلا تاثر تھا۔ اس پریوں کی سرزمین کا کہ جس کا میں نے سپنا دیکھا تھا۔ میں نے اپنی مایوس نظریں آدمی کی کارگزاری سے اٹھا کر پُر وقار پہاڑی مناظر کی طرف پھیر لیں۔ جہاں برفانی سفیدی سے بھری ہوئی ہزاروں چوٹیاں تھیں۔ ان کا وقار اس پُر سکون پہاڑی وادی کو منفرد حیثیت بخش رہا تھا۔ سیدھی سادی قدرت کی پُر وقار رنگینی اور انسان کی بے پناہ تشنہ آرزوئیں! کس قدر تضاد تھا۔

اور اسی افراط و تفریط سے میرا دل جذبات سے بھر گیا اور قدرت کے معصوم جمال کا عکس میرے دل پر مرتسم ہو گیا اور انسانی کارناموں کی اہمیت کے سائے پھیکے پڑنے لگے۔ میں مجسم سوال بن گیا۔

کیا میں نے پروردگار کی بارگاہ عالیہ میں اپنا شکرانہ ادا کیا ہے۔ جس نے مجھے اس جگہ پہنچنے کی سعادت بخشی ہے مجھے کس قدر موقعہ فراہم ہوا ہے کہ میں اس کا شکرانہ ادا کروں یا سنجیدگی سے غور و فکر کروں؟

یہاں میں ہوں، اس سرزمین پر — جو بعض لوگوں کے نزدیک دنیا کا خوبصورت ترین مقام تصور کیا جاتا ہے۔ یہ لڑکھڑاتے ہوئے کھنڈر انسانی عظمت کی ناپائیداری پر تصدیق کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ انسان نے جو چیز بھی تخلیق کی وہ تباہی کی منزلوں سے گزر رہی ہے لیکن اس کے ساتھ تخریب کا حسن شامل نہیں۔ جب کہ قدرت ہمیشہ کی طرح اسی توانائی، سرمستی اور زندگی کی تب و تاب کے ساتھ مہکتی ہے۔ [1]

افغان عہد کے مقابلے میں لوگ مطمئن ہیں ہیوگل کے الفاظ ہیں:

"لوگ عدل و انصاف سے مطمئن نظر آتے ہیں۔ انہوں نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ بیس میں

---

[1] BARON CHARLES HUGEL: KASHMIR & PONJAB P. 107

سے ایک آدمی کو اپنے جرائم کی سزا ملتی ہے۔ وحشتناک سزائیں مثلاً معمولی جرائم کے لیے کان یا ناک کے کاٹے جانے کا اب حکم نہیں ملتا جیسا ابتدائی حکمرانوں کے عہد میں ہوتا تھا۔ اس لیے لوگ آج کل کی مقابلتاً نرم حکومت کی کارکردگی سے مطمئن ہیں۔ حقیقت میں اب گورنروں اور تھانے داروں کی طرف سے بہت کم مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔" [1]

رچرڈ ٹمپل

سر رچرڈ ٹمپل بارٹ نے جموں و کشمیر کی سیاحت ۸ر جون سے ۸ر جولائی ۱۸۵۹ء کے دوران کی۔ رچرڈ ٹمپل کئی کتابوں کا مصنف ہے۔ اپنی سیاحت کے دوران اس نے اپنی یادداشتوں کو ایک ڈائری کی شکل میں مرتب کیا۔ اس کی یہ ڈائری حیدر آباد، سکم، نیپال اور کشمیر کی سیاحت کے حالات پر مشتمل ہے۔ کشمیر سے متعلق اس کی ڈائری کے اوراق ایک قابل قدر معاصرانہ مطالعہ پیش کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کشمیر میں سکھ عہد ختم ہو چکا تھا اور مہاراجہ گلاب سنگھ ڈوگرہ حکومت کی بنیاد ڈال چکا تھا۔ رچرڈ ٹمپل نے اپنی ڈائری میں ایک خوب صورت اسلوب برتا ہے اور بڑی جگرکاوی سے یہاں کے عظیم اور قدیم تمدن کو کھنگالا ہے۔ جگہ جگہ گھوم کر یہاں کی قدیم عمارتوں اور کھنڈرات کی اصل کو سمجھنے کی کوشش کی اور ان کو وضاحت سے بیان کیا۔ وہ اونتی پورہ کے کھنڈرات کی نشاندہی چار میلی لمبے رقبے پر کرتا ہے اور اسی طرح پاندریٹھن

---

[1] BARON CHARLES HUGEL: KASHMIR & PUNJAB p. 156

(پران ادھشٹان) کے شہر کے کھنڈر دو میل پھیلے ہوئے رقبے پر بیان کرتا ہے۔ رچرڈ ٹمپل کے سفرنامے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک سیاح تھا بلکہ پتھروں کی زبان سمجھنے والا ماہر بھی تھا۔ مندروں اور دیواروں اور قدیم عمارتوں کو بہ نظر غائر دیکھنے والا یہ سیاح ڈوگرہ شاہی کے انتظامیہ پر بھی تنقیدی نگاہ ڈالتا ہے۔ وہ کشمیر کے قدرتی مناظر دیکھ کر مبہوت ہو جاتا ہے۔ رچرڈ ٹمپل کا سفرنامہ "کشمیریات" میں یقیناً ایک اضافہ ہے۔ چند اقتباسات سے اس کا بخوبی اندازہ ہوگا۔

۱۔ "شام کو ہم کھنڈرات دیکھنے چلے گئے۔ پہلا کھنڈر دریا کے کنارے ہے۔ اس کھنڈر کا بیشتر حصہ زمین کے اوپر نظر نہیں آتا۔ وہاں صرف پتھر اور ایسے نشانات ملتے ہیں جو صرف وسیع اور پھیلے ہوئے ڈھیروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم جیبرار کے گاؤں میں چلے گئے جو قریباً ایک میل کی مسافت پر تھا۔ یہاں مکمل کھنڈر ہیں جو زبان حال سے پکارتے ہیں کہ یہ کسی بڑے مندر کے ساتھ ملحقہ کسی عبادت گاہ کے ساتھ وابستہ رہے ہیں۔ ایسے ہی کھنڈرات ہم مارتنڈ میں دیکھ چکے تھے۔ مرکزی عمارت کی چھت اور اوپر کا حصہ زمین سے تھوڑا سا ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اس کے ساتھ جو ملحقہ املاک ہے۔ اس کے نشانات بھی ملتے ہیں۔ اس کے قریب پرانے نشان ہیں جو کسی شاہی محل کے معلوم ہوتے ہیں۔ قریبی پہاڑیوں کی چوٹیاں

پتھروں سے ڈھکی معلوم ہوتے ہیں۔ موجودہ کھنڈرات
دریا کے کنارے زمین پر کھڑے ہیں۔ یہ مناظر مرعوب
کرنے والے ہیں اور تقریباً چار میل کی لمبائی پر پہاڑوں
کے دامن میں وتستا کے دائیں کنارے پر پھیلے ہوئے
ہیں یہ سب چیزیں اونتی پورہ کے آثار قدیمہ میں
ہیں جو کشمیر کا قدیم دارالخلافہ ہے ان کھنڈرات
کا فن تعمیر اور صناعی مارتنڈ کے کھنڈرات سے مشابہ
ہے اور تقریباً اسی عہد اور انہی فن کاروں سے
تعلق رکھتا ہے۔" ١ے

اب رچرڈ ٹمپل کی شاعرانہ نظر ملاحظہ فرمائیے:۔

٢۔ اپنے کیمپ میں شام کی مٹیالی روشنی میں لوٹنے
کے بعد میں نے دریا کی خاموش سطح پر نظر ڈالی جس
میں آس پاس کی اور آسمان کی تمام چیزیں منعکس
ہو رہی تھیں تب میں نے پہاڑوں پر نظر ڈالی اور
پھر خوب صورت وادی پر اور پھر سامنے کے برفانی
سلسلوں کو دیکھا جو اب نظروں سے اوجھل ہو رہے
تھے۔ ایسی ہی تمام چیزیں اونتی ورمن کی آنکھوں کو
بھی نظر آئی ہوں گی جس نے اس جگہ کی بنیاد تقریباً

١ے SIR RICHARD TEMPLE BARAT : JOURNALS KEPT IN HYDERABAD KASHMIR, SIKKIM & NEPAL P. 40-41.

ایک ہزار سال قبل ڈالی تھی اور میں نے سوچا کہ یہ کس قدر خوبصورت جگہ ہے۔ یقیناً کشمیر تاریخ اور روایت کی سرزمین ہے۔" لے

۳۔ "شنکر آچاریہ کی بلندی سے میں کشمیر کے مناظر دیکھتا ہوں۔ ایک ایسا سماں سامنے نظر آتا ہے۔ جو نہایت عمدہ ہے اور میں نے کبھی اپنے وطن میں نہیں دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ دنیا کا خوب صورت ترین سماں ہے۔ یہ نظارہ ساری وادی پر پھیلا ہوا ہے جو ہر چہار اطراف برفانی سلسلہ ہائے کوہ سے گھرا ہوا ہے۔" ۲ے

۴۔ "صبح سویرے ہم کشتی کے ذریعے پاندریٹھن کے کھنڈرات دیکھنے کے لئے چلے گئے۔ یہ پرانے شہر کی جگہ ہے اور تخت سلیمان کے مشرق میں واقع ہے۔ یہاں کی ایک خصوصیت ایک مندر ہے جو جل دیوی کا استھاپن ہے اور گھاس سے بھرے ہوئے تالاب میں واقع ہے۔ اس کا فنِ تعمیر تخت سلیمان کے مندر سے مشابہ ہے شہر کے کھنڈر تقریباً دو میل تک پھیلے ہوئے ہیں اور دورِ حاضر

لے SIR RICHARD TEMPLE BART: JOURNAL KEPT IN HYDERABAD, KASHMIR, SIKKIM & NEPAL P. 41

۲ے IBID P. 48

کی عمارتوں کے لیے ان خاکستری رنگت والے
پتھروں کی تباہ کاری کا خیال کر کے دل مسوس
اٹھتا ہے۔"[1]

۵۔ "شہنشاہ جہانگیر ویری ناگ کو اپنی وسیع وعریض
سلطنت میں سب سے زیادہ پسند کرتا تھا اور جب
اس پر فالج گرا اور اُسے یقین ہو گیا کہ موت قریب
آگئی ہے تو اس نے خواہش ظاہر کی کہ اسے پنجاب
سے ویری ناگ لایا جائے لیکن وہ کبھی بھی پیر پنچال
نہ پہنچ پایا اور بہرام گلہ کے مقام پر انتقال کیا۔ یقیناً
یہ ایسی جگہ ہے جہاں آدمی موت کی نیند سونا پسند کرے۔"[2]

رچرڈ ٹمپل کی ڈائری معلومات کا خزانہ ہے جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس سیاح نے بہت ہی قلیل عرصے میں اس قدر معلومات کہاں سے فراہم کی تھیں۔ جہاں کہیں وہ گھوما ہے وہاں کی ہر چیز کو اس نے ایک شاعر، ایک مورخ اور آثار قدیمہ سے دل چسپی رکھنے والے محقق کی نظر سے دیکھا ہے اور اسے اپنی ڈائری میں درج کیا ہے۔

فرانسس ینگ ہسبنڈ

ینگ ہسبنڈ پہلی بار ۱۸۸۷ء میں کشمیر آیا۔ ہندوستان میں کئی عہدوں پر فائز رہا۔ کشمیر میں یار ریذیڈنٹ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ کشمیر سے اس کی دل چسپی

۱ے SIR RICHARD TEMPLE BART: JOURNALS KEPT IN HYDERABAD, KASHMIR, SIKKIM & NEPAL p. 59

۲ے ایضاً

اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ ۲۱ برس اس وادی میں رہا اور یہاں کے چپے چپے میں گھوما ینگ ہسبنڈ نے اپنے تاثرات اپنی کتاب "کشمیر" میں درج کیے ہیں جو یہاں کی زندگی، یہاں کی آب و ہوا، پہاڑوں اور جھیلوں اور حسن قدرت کے جلوؤں کو بیان کرتی ہے۔ ینگ ہسبنڈ کے سینے میں ایک شاعر کا دل ہے وہ یہاں کے جلوۂ صد رنگ کو بیان کرنے کے لئے شاعرانہ اسلوب برتتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان جلوؤں کو دیکھنے کے لئے جگہ جگہ گھوما ہے اور ہزار زاویوں سے اس حسن دلنواز سے مسحور ہوا ہے۔

ایک اقتباس:

"کشمیر کے حسن کی کشش صرف یہ نہیں ہے کہ یہاں کا ہر مقام ہر دن ایک نئی جلوہ سامانی لے آتا ہے۔ روشن اور سہانے دن بہت زیادہ ہیں لیکن پھیکے اور بے جان دن بھی پُر کشش ہیں۔" ۱؎

مغرب کی جنت سوئیٹزرلینڈ کے ساتھ کشمیر کا موازنہ بہت خوب ہے۔ یہ سیاح سوئیٹزرلینڈ کے قدرتی حسن سے بھی متاثر نظر آتا ہے لیکن جو چیز اسے کشمیر کے پہاڑوں اور برف زاروں میں نظر آتی ہے وہ سوئیٹزرلینڈ میں کہاں؟ کشمیر کا جہاں بھی ذکر کرتا ہے وہ کھو سا جاتا ہے۔

ایک اقتباس:

"جس ملک کے ساتھ کشمیر کا موازنہ کیا جا سکتا ہے وہ قدرتی طور پر سوئیٹزرلینڈ ہے۔ سوئیٹزرلینڈ بلا شبہ بڑی خوب صورت جگہ ہے جو جھیلوں اور پہاڑیوں

۱؎ YOUNG HUSBAND: KASHMIR PAGE 20.

کے امتزاج سے کشمیر سے بڑھ کر ہے لیکن یہ مقام ایک چھوٹی سی جگہ پر واقع ہے۔ وہاں کشمیر کی طرح برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا پھیلاؤ نہیں ہے۔ وہاں ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں برفانی پہاڑوں کے مکمل ہالے کو دیکھا جا سکے جو کشمیر کے طول و عرض کی طرح انہیں ہموار میدانوں میں نظر آتا ہے۔ سوئٹزر لینڈ کی مرکزی وادی کشمیر کی وادیوں کے صرف اطراف کی طرح ہے۔ اس کے علاوہ سوئٹزر لینڈ کے پس منظر میں کشمیر کی طرح ایسے پہاڑوں کا کوئی جلوہ نظر نہیں آتا جو دنیا کے کسی اور خطے میں بھی عنقا ہے۔" لہ

سر والٹر لارنس

کشمیر سے سر والٹر لارنس کا تعلق گہرا رہا ہے۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے عہد حکومت میں لارنس بندوبست اراضی کے اعلیٰ افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا رہا۔ اپنے منصبی فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں لارنس کو وادی کے بیشتر دیہاتوں اور خطوں میں گھومنے کا موقع ملا۔ اور اس نے نہایت قریب سے یہاں کے لوگوں کو دیکھا۔ لارنس کی قابلِ قدر کتاب 'ویلی آف کشمیر' قیمتی معلومات کا خزانہ ہے۔ لارنس کا مطالعہ ایک سیلانی کا سرسری مطالعہ نہیں ہے۔ اس نے خلوص اور ہمدردی سے یہاں کے لوگوں اور ان کی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی ہے اور ان کے دکھ درد اور رنج و غم کے

لہ YOUNG HUSBAND: KASHMIR PAGE NO. 7-8

پس پشت جو محرکات رہے ہیں ان کا ذکر کیا ہے۔ لارنس خاص طور پر پٹھان عہد کی سفاکیوں کا ذکر کرتا ہے۔ کشمیریوں کے کردار کے بارے میں جو خیالات اس سے قبل کے سفرناموں میں ملتے ہیں۔ وہ ان سے اختلاف کرتا ہے اور یہاں کے روشن پہلوؤں کا ذکر بھی خلوص سے کرتا ہے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں :-

"میرا خیال ہے کہ کشمیریوں کے بارے میں اکثر جو سخت سست باتیں کہی جاتی ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ ان کے کردار کی ترجمانی کرنے والے اکثر غیر ملکی رہے ہیں جو اکثر حالتوں میں رشوت خوار رہے ہیں اور جن کا رویہ غیر ہمدردانہ ہے۔ مثلاً پٹھان، سکھ اور ڈوگرہ گورنروں نے انتظامیہ میں ایسی کارکردگی انجام دی ہے۔ جو ان کے آقاؤں کے سرچشموں سے پھوٹتا ہے۔ یہ کہنا کہ کشمیری بے ایمان، غدار اور ظلم پرست تھے۔ پرانی کہانی ہے کہ "کتے کو برا نام دو اور اسے ہلاک کرو" مجھے اعتراف ہے کہ کشمیر میں اپنے منصبی فرائض کے ابتدائی سال کے دوران میرا بھی ایسا ہی خیال تھا۔ لیکن بہت جلد میں نے محسوس کیا کہ ہر دوسرے مشرقی کی طرح کشمیری کردار کے دو پہلو ہیں۔ تاریک اور روشن ہر کشمیری کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ اسے تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ کھیت جوت سکے اور اونی کپڑا بن سکے۔ کشمیری کردار کا تاریک پہلو اس وقت ابھرتا

ہے جب کشمیری افسر کا سامنا کرتا ہے۔ وہ حق بجانب ہے کہ وہ ان سے نفرت کرے اور ان پر اعتماد نہ کرے۔ اس صورت میں اس کا ہتھیار صرف یہ ہے کہ وہ دھوکہ دہی سے کام لے۔ لیکن اس کے کردار کا روشن پہلو اس وقت آئینہ ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر اپنی رفیقۂ حیات اور بچوں کے درمیان بیٹھا ہو۔"[1]

۲۔ جب میں ۱۸۸۹ء میں پہلی بار کشمیر آیا، میں نے لوگوں کو بے زار، پریشان حال اور سہما ہوا پایا۔ سالہا سال تک ان کو سکھایا گیا تھا کہ وہ غلام ہیں جن کے کوئی حقوق نہیں ہیں۔ لیکن جن کے پاس بہت سی معذوریاں ضرور ہیں۔ ان کو ظلم پرست کہا جاتا رہا ہے اور ان کے طبقے کو ہر طرح کی سہولیت بہم پہنچائی جاتی تھیں۔ سپاہی ان کو مجبور کرتے تھے کہ وہ ہل چلائیں اور بیج بوئیں۔ لیکن وہی سپاہی فصل کاٹنے کے اوقات پر حاضر ہوتے تھے لوگ اپنے مکانوں سے باہر گھسیٹے جاتے تھے تاکہ وہ گلگت تک بلا اجرت سامان ڈھو کر لے جائیں اور یہ کہ ہر افسر کو ان کی محنت اور ان کی جائیداد پر پورا پورا حق حاصل تھا۔[2]

---

[1] SIR WALTER LAWRANCE: VALLEY OF KASHMIR P. 5

[2] Ibid P. 2

۳۔ کشمیر کے ہر طبقے کو اطمینان حاصل ہوا ہوگا۔ جب انہوں نے افغانوں کی سفاک حکومت کا زوال دیکھا ہوگا۔ یہ اطمینان کسانوں سے زیادہ اور کسی طبقے کو حاصل نہ ہوا جن کی چمڑی کابل کے سفاک سرداروں نے اپنے تشدد سے ادھیڑ دی تھی۔ میرے کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ سکھ عہد میں اچھائی یا برائی تھی بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ عہد یقیناً پٹھان عہد سے بہتر تھا۔" لے

ٹینڈل بسکو

ٹینڈل بسکو بلند مرتبت ماہر تعلیم تھا جس نے کشمیر میں مغربی تعلیم کا پہلا چراغ روشن کیا۔ ۱۸۹۰ء میں کشمیر آیا اور پھر اس کی زندگی کا بہترین زمانہ یہیں گزرا اس نے پوری زندگی یہاں کے لوگوں کو مغربی علم اور مغربی مزاج سے روشناس کرانے میں صرف کی۔ سر والٹر لارنس کی طرح ٹینڈل بسکو نے اس بستی میں سال ہا سال گزارے اور یہاں کے سرد و گرم کو دیکھا اور محسوس کیا۔ بعض مغربی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کشمیریوں کے کردار کو منفی روپ میں پیش کر کے...... یہ جتلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ لوگ دھوکے باز ہیں اور انہیں اپنی عزت اور غیرت کا کوئی خیال نہیں بسکو یہ بات جان گئے تھے کہ یہ ساری برائیاں جو کشمیریوں کی زندگی پر تھوپ دی گئی تھیں۔ دراصل اس ظلم و تشدد کے نظام کی دین تھیں۔ جس نے صدیوں سے اس بدقسمت قوم کو غلام بنا رکھا تھا۔ بسکو اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں :-

---

لے SIR WALTER LAWRANCE: VALLEY OF KASHMIR P.2

"لیکن وہ دنیا بھر کے لوگوں سے مختلف کیوں ہیں؟
کیونکہ وہ دنیا کی خوب صورت ترین جگہ پر رہتے ہیں
اس لئے دوسرے لوگوں نے انہیں ہوس کا شکار بنایا
ہے۔ کشمیر کو بار بار مفتوح بنایا ہے۔ دراندازوں نے
بار بار نہ صرف ان کے آباؤ اجداد کو غلام در غلام بنایا۔
بلکہ ان کو قتل کیا اور ظلم و تشدد کی چکی میں پیس لیا۔
اور اس طرح ان کی روح کو ان کے جسم سے باہر
نکال دیا اور ان کی شخصیت ختم کردی۔ یہ بات وثوق
کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اگر ہم اہل برطانیہ کو
اس طرح کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا، جس میں
سے ماضی کے دوران کشمیری گزرے ہیں تو ہم اپنا
مردانگی کھو چکے ہوتے" [1]

بیسویں صدی کے دوران بیسیوں دیگر سیاح آئے جن کے سفرناموں کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ ان کی یادداشتیں اس وادی دلفریب کے نکھار کو نئی جہتیں عطا کرتی ہیں ـــــ

---

[1] BISCOVE TYNDALE :
KASHMIR IN SUNLIGHT & SHADE P. 79

کشمیر — لباس اور رہن سہن

کشمیر صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس کے قدرتی حسن وجمال نے کتنے ہی دلوں کو برمایا ہے۔ تاریخی اور نیم تاریخی شہادتوں سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ یہاں کے پہاڑوں، جھیلوں اور خوب رو پھولوں کی شاداب وادیوں نے کتنی ہی ہوس ناک نگاہوں کے قہر کو جھیلا ہے۔ اور کتنے ہی صحراؤں کی خاک چھاننے والوں کو پناہ دے کر ان کی تہذیبوں کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ یہ قومیں جو مختلف زمانوں میں یہاں آئیں اکثر و بیشتر یہاں کی خاک دامن گیر میں جذب ہو گئیں۔ بڑی بڑی سلطنتیں بنیں اور مسمار ہوئیں۔ علم و عرفان کی ان گنت شمعیں فروزاں ہوئیں اور وقت کی تند آندھی کے سامنے بجھ گئیں یہاں کے پتھروں، مندروں، وہاروں، مسجدوں اور محرابوں کے پس پشت ایک نہ ختم ہونے والی پُراسرار داستان چھپی ہوئی ہے۔ جو اہل نظر کو آج بھی دعوتِ فکر دیتی ہے اور ان زمانوں کی یاد

دلاتی ہے۔ جب انسان نے تاریخ، سائینس، نفسیات، علم بشریات اور دیگر علوم و فنون کا درس حاصل نہیں کیا تھا۔

برزہامہ کے کھنڈر عیسیٰؑ سے تین چار سو سال قبل کے زمانہ پر سے نقاب سرکاتے ہیں۔ ہاروں کی کھدائی سے ملی ہوئی چیزیں کشان تہذیب پر روشنی ڈالتی ہیں جو پہلی صدی عیسوی میں کشمیر آئے۔ اس عہد میں یوچی قبیلہ کے لوگ بھی یہاں وارد ہوئے جن کو بعض تاریخ داں انہی کی ایک شاخ قرار دیتے ہیں۔ ان کے بعد ہن آئے۔ ڈاکٹر سنیل چندر رے کا خیال ہے کہ ہاروں (جو اس زمانے میں سدا ہاروں کہلاتا تھا) سے بت تراشی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ وسط ایشیائی قبیلوں کے نسلی خدوخال کو ظاہر کرتے ہیں یہ لوگ وادی میں چوتھی صدی عیسوی میں یا اس سے ذرا بعد میں یہاں آباد ہوئے۔[1] ہنوں کے بعد گرجارا قبیلے کے لوگ آباد ہوئے جن کا تعلق سیتھن نسل سے تھا۔ ہنوں کے بعد بھٹوں کے آنے کا سلسلہ شروع ہوا اور سال ہا سال تک باہر سے آنے والوں کا یہ نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری رہا۔

مختلف نسلوں اور رنگوں کے یہ لوگ یہاں آکر اس مٹی میں جذب ہو گئے اور اپنے پیش روؤں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان کے درمیان خط تنسیخ کھینچنا محال ہے۔ یہاں کے جغرافیائی حالات نے ان کی زندگی کے ہر شعبے کا عنوان بدل دیا۔ تہذیب اور تاریخ کی مختلف منزلوں میں سے گزرتے ہوئے ان لوگوں پر کیا بیتی اور وقت کے تقاضوں کے پیش نظر رفتہ رفتہ ان میں کون سی تبدیلیاں رونما ہوئیں اس کا مطالعہ خاصا دلچسپ ہے۔ یہاں صرف ان کے لباس اور رہن سہن

---

[1] DR. S.C. RAY: EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR, PAGE 27-28

کی تبدیلیوں کا مختصر ذکر کرنا مطلوب ہے۔

لباس اور رہن سہن کا تعلق محض انسان کی ستر پوشی تک ہی محدود نہیں اور نہ صرف یہ موسموں کے گرم و سرد سے تحفظ کا متقاضی ہے۔ بلکہ دوسرے شعبوں کی طرح یہ انسانی تہذیب اور قومی روایات کی جڑیں دور دور تک اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ انسان کی سماجی اور تہذیبی زندگی میں لباس، رہن سہن اور طرز زندگی کا بنیادی رول ہے۔ اس لئے جب ہم صدیوں پرانے زمانے کی تہیں کھرچتے ہیں تو اس آئینے میں ہم اس زمانے کی تصویر ٹٹول سکتے ہیں۔

دورِ قدیم

آر۔ سی۔ کاک کی قابل قدر تصنیف، جس کا تعلق قدیم یادگاروں سے ہے، پہلی صدی عیسوی کی تہذیبی زندگی پر خاصی روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں اس زمانہ سے تعلق رکھنے والے فن بت تراشی کے چند نمونوں کی تصویریں ملتی ہیں۔ جو ہارون سے دستیاب ہوئی ہیں۔ یہ کشان عہد کی انٹیں ہیں اور برزہامہ تہذیب کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں ہم صرف ان کے ملبوسات کا ذکر کریں گے۔ ان تصویروں کا بغور مشاہدہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ :۔

۱۔ اس زمانہ میں عورتیں لہنگا کے مشابہ پیٹی کوٹ استعمال کرتی تھیں۔

۲۔ کسی باریک کپڑے کو ساڑھی کے مانند پہنتی تھیں۔

۳۔ مرد سر کو ڈھانپنے کے لئے پگڑی سے مشابہ کوئی چیز استعمال کرتے تھے۔

۴۔ جسم کو ڈھانپنے کے لئے چیغے کے مانند کوئی باریک اور لمبا کپڑا استعمال کیا جاتا تھا۔

۵۔ موسیقار خواتین پاجامہ کی طرح کی کوئی چیز استعمال کرتی تھیں۔

۶۔ رقاصائیں، ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنتی تھیں۔ یہ کپڑے پاجامہ، آستینوں والی قمیص اور اوڑھنی پر مشتمل ہوتے تھے۔

۷۔ مرد لہنگا کے مانند کپڑا باندھتے تھے جس کا پلکا لٹکا رہتا تھا۔

۸۔ کمر کسی کپڑے سے بندھی رہتی تھی۔

۹۔ عورتوں کے بال سجے ہوئے ہوتے تھے۔ بالوں میں جوڑا باندھا جاتا تھا اور کانوں میں بڑی بڑی بالیاں ہوتی تھیں۔

۱۰۔ سجاوٹ اور زیبائش بے مثال ہوتی تھی۔

ڈاکٹر رے کے مطابق یہ ملبوسات جن کا عکس ہارون کی اینٹوں میں ملتا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ان پر بلاشبہ وسط ایشیا کے لباس کا اثر نمایاں ہے[۱] لیکن ان ملبوسات کے بارے میں حتمی طور پر یہ متعین کرنا کہ ان کا استعمال وسط ایشیائی طرز میں کب ہوا، مشکل ہے۔ بامزئی کا خیال ہے کہ ان ملبوسات پر وسط ایشیائی اثرات غالباً عیسوی سنہ کی شروع کی صدیوں میں ہوا ہوگا۔[۲] آر۔ سی۔ کاک کی تصنیف "کشمیر کی قدیم یادگاریں" میں ہارون ٹائیلز سے متعلق جو ٹیلیں موجود ہیں ان میں سے چند ایک کی تفصیل ملاحظہ ہو:۔

۱۔ مرد۔ بائیں ہاتھ میں کنول کی کونپل لئے ہوئے
ایک گھوڑ سوار، زرہ بکتر پہنے ہوئے کمان کھینچے
ہوئے اور پوری رفتار سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے۔

۱۔ DR. S. C. RAY: EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR. P. 256

۲۔ P. N. K. BAMZAI: A HISTORY OF KASHMIR PAGE 238.

اس کے دائیں طرف زمین کے ساتھ بندھا ہوا ترنگا

پیٹھ پر کپڑے کے دو لہراتے ہوئے سرے ہیں[1]

۲۔ شفاف لباس میں ملبوس شبیہ ۔ اپنے بائیں طرف

قدم بڑھاتے ہوئے ۔ سر پر پہنی ہوئی پگڑی،

کانوں میں لمبی لمبی بالیاں آویزاں ہیں[2]

۳۔ پنہارن، پانی کے دو برتن اٹھائے ہوئے ۔ دائیں

طرف باریک کپڑے اور جبہ پہنے ہوئے عورت ۔ اوپر

اٹھے ہوئے بائیں ہاتھ میں گل دان یا مشک ڈالے اور

بائیں ہاتھ سے لہنگا تھامے ہوئے ۔[3]

۴۔ زنانہ موسیقار ۔ پاجامہ پہنے ہوئے، بائیں کندھے

سے لٹکے ہوئے ڈھول کو بجا رہی ہے ۔ کانوں میں

بالیاں پہنے ہوئے ہے ۔[4]

(ساتویں میں ایک مرد کی تصویر جس کی کمر بندھی ہوئی

ہے اور لہنگا بندھا ہوا ہے جس کا لچکا لٹک رہا ہے)

۵۔ ایک رقاصہ ۔ کانوں میں بڑی بڑی بالیاں ، ڈھیلے

ڈھالے کپڑوں میں ملبوس دونوں ہاتھوں سے

سر کے اوپر پھیلا ہوا اسکارف تھامے ہوئے ۔[5]

۱؎ R. C. KAK: ANCIENT MANOMENTS OF KASHMIR PLATE XXIII

۲؎ " " " " " " " " " XXIV

۳؎ " " " " " " " " XXV

۴؎ " " " " " " " " XXVII

۵؎ " " XXVII

(اس لباس میں آجکل کی رقاصاؤں کے ملبوسات
کا اسٹائیل ہے۔ بال خوبصورتی سے گوندھے، ڈھیلا
ڈھیلا پاجامہ اور قمیض)

لباس کے ساتھ ساتھ زیورات اور آرائش وزیبائش کی اہمیت زمانہ قدیم میں بھی اسی طرح تھی جس طرح زمانہ حال میں ہے۔ اوسکر سے بت تراشی کے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ لوگ بڑی آن بان اور ذوق وشوق سے اپنی آرائش کا سامان کرتے تھے۔ حتیٰ کہ طرح طرح کے زیورات کا استعمال عام تھا۔ کلہن نے راج ترنگنی میں قدیم زیورات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے مطابق خواتین کنگن، پازیب، بالیاں وغیرہ استعمال کرتی تھیں [۱] کھیمندر کی تحریروں میں بھی جواہرات سے مرصع کالر کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح کئی قدیم یادداشتوں میں ماتھے کی افشاں اور چوٹی کو باندھنے والے سنہرے دھاگے کا ذکر بھی ملتا ہے۔ خواتین کے ساتھ ساتھ مردوں کے زیورات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بازو بند، کنگن، ہار، انگوٹھی، بالیوں وغیرہ کی تفصیل بھی ملتی ہے۔ ڈاکٹر رے نے اس کے علاوہ فولادی تلووں والے جوتوں لکڑی کی بنی ہوئی سینڈلوں کمر سے لٹکنے والی تلواروں کو مردوں کے پہناوے میں شامل کیا ہے۔ آر۔ سی۔ کاک کی ہینڈ بک ARCHEOLOGICAL AND NUMISMATIC SECTION OF S.P.S MUSEUM SGR. کے حوالے سے ڈاکٹر رے لکھتے ہیں:-

"اوسکر سے حاصل کئے ہوئے بت تراشی کے
ٹکڑوں میں کہنی سے اوپر کے بازو میں تسبیح کے
دانوں والا بازو بند ملا ہے۔ جو اسی طرح کے ایک

---

[۱] کلہن: راج ترنگنی جلد اول ص ۳۴۴ (مترجمہ ارل سٹین) مکرر اشاعت ۱۹۷۹ء

ہاتھ سے نیکلیس کے ساتھ جڑا ہوا دکھائی دیتا
ہے۔ دوسرے بازو میں کلائی کے گرد ایک کنگن ہے۔
......ٹوٹے ہوئے بائیں ہاتھ کی چھنگلی میں ایک
انگوٹھی ہے۔"[۱]

ایک اور جگہ یوں لکھا ہے:

"پاندریٹھن سے حاصل کئے ہوئے ایک بودھی ساتھوا الوکی تیسور کی مورتی ملی ہے جو بھاری بھرکم زیورات سے لدی پھندی ہے۔ اس میں تین سروں والا مکٹ ایک مرصع نیکلیس، جواہرات سے سجا ہوا کنگن اور کمر میں بندھا ہوا ایک کمر بند دیکھا جا سکتا ہے۔ جو دھوتی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ یہ زیورات عام سماجی زندگی سے لئے گئے ہوں گے۔ اونتی پورہ کی ایک ویشنو مورتی کے سر پر تین سروں والا مرصع مکٹ سجا ہوا ہے جس میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ جواہرات جڑے ہوئے ہیں یہ عین ممکن ہے کہ ایسے ہی ہلالی شکل کے تاج اس زمانہ میں یہاں کے راجے استعمال کرتے رہے ہوں۔ کلہن کا کہنا ہے کہ راجہ اننت پانچ سروں والے نور پاش ہلالی مکٹ کو استعمال کرتا تھا۔"[۲]

DR. S.C. RAY: EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR PAGE 256 [۱]

Ibid PAGE 256 [۲]

ان بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مورتیوں کو زیورات سے سجایا ہوا دکھایا گیا ہے اور یہ زیورات محض تخیل کی پیداوار نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق یہاں کی مقامی زندگی سے ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ یہاں اس طرح کے زیورات استعمال کئے جاتے رہے ہوں گے جن کا عکس ان مورتیوں میں دکھایا گیا ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ ان کا بیشتر حصہ راجاؤں، رانیوں اور امراء کے یہاں استعمال کئے جانے والے زیورات سے لیا گیا ہوگا۔ لیکن مورتیاں بنانے والے اور پتھروں کو کاٹ کاٹ کر انسانی شبیہ بنانے والے عام لوگ ہی رہے ہوں گے۔ اس لئے اُن کی اپنی زندگی کا عکس کسی نہ کسی پہلو سے ان مورتیوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس دور میں عام لوگوں کے رہنے بسنے کا سلیقہ شائستہ تھا۔ وہ اپنے فرصت کے لمحات میں تفریح طبع کا سامان کرتے تھے۔ موسیقی ہر دور کی طرح روح کی غذا تھی۔ لوگوں کو رقص و ناٹک سے دل چسپی تھی۔ ہارون کی ایک ٹائیل پر ایک زنانہ موسیقار کو دیکھا جا سکتا ہے جو ڈھول بجا رہی ہے۔ دوسری عورت رقص کرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ کلہن کے مطابق اس زمانے میں رقص و موسیقی کی محفلیں بڑے بڑے ہالوں میں منعقد ہوتی تھیں اور لوگ بڑے چاؤ سے ان میں شریک ہوتے تھے[1] اسی زمانے میں "رتناولی" نام کا ڈراما تخلیق ہوا۔ ناٹیہ شاستر کو بڑی اہمیت حاصل تھی اور رقص کی باضابطہ تربیت ہوتی تھی۔ کٹھ پتلی ناچ کا رواج بھی تھا۔ رسل و رسائل کے ذرائع محدود تھے۔ سواری کے لئے گھوڑے، کشتیاں، ہاتھی، پالکیاں عام طور سے استعمال ہوتی تھیں۔ ہارون کی اینٹوں پر ہاتھی کی تصویر اس بات پر تصدیق کی مہر ثبت کرتی ہے کہ اس زمانہ میں ہاتھی ملتے تھے کلہن نے بھی ہاتھیوں

---

1. کلہن: راج ترنگنی جلد اول (مترجمہ ارل سٹین) مکرر اشاعت ۱۹۷۹ء ص ۳۵۶

کا ذکر کیا ہے [1]

نیل مت پران چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے آس پاس لکھا گیا [2] جو زمانہ قدیم کی کشمیری تہذیب و تمدن کے کئی اسرار کھولتا ہے۔ نیل مت میں لباس کیلئے وستر، امبر، واسس، داسہ اور سام ذنا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں [3] اس میں چین سے درآمد کئے ہوئے ریشم کا نام "سن موسکا" بتایا گیا ہے۔ "کمبلہ" اونی کمبل کے لئے اور "پروارنہ" نئی برف باری کے وقت پہنے جانے والے لباس کے لئے مستعمل ہوا ہے پروارہ کا ذکر مہابھارت میں بھی ہوا ہے [4] اور یہ لباس کڑاکے کی سردی میں سردی سے تحفظ کرتا تھا۔ نیل مت پران کے مطابق کشمیری لباس دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصہ جسم کے اوپر والے حصے کو ڈھانپتا تھا اور دوسرا حصہ دھڑ کے نچلے حصے کو یہ دونوں حصے سفید بھی ہوتے تھے اور رنگین بھی۔ بعد کے سالوں میں بودھ بھکشوؤں نے جس لباس کا استعمال شروع کیا وہ بودھ ادب میں سوارا (CIVARA) کہلاتا ہے۔ نئے کپڑوں کے لئے "اہتہ" (AHATA) کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ اپنے پیش روؤں کی طرح یہ لوگ بھی زیورات اور آرائش و زیبائش کے شوقین تھے۔ اس وقت بھی کانوں میں بالیاں پہننے کا رواج تھا۔ نیل مت پران میں مکٹ، مالا، بازو بند، بالی اور جواہرات کا ذکر بار بار آیا ہے۔ یہاں کئی خوشبوؤں کا ذکر بھی ملتا ہے جن کا استعمال اکثر ہوتا تھا۔ پوجا کے وقت لوگ نہ صرف مورتیوں کو مالاؤں سے آراستہ کرتے تھے بلکہ ان کو خوشبوؤں سے بھی معطر کرتے تھے۔ نیل مت

---

[1] کلہن: راج ترنگنی جلد اول (مترجمہ ارل سٹین) مکرر اشاعت ۱۹۷۹، ص ۲۵۶

[2] بعض محققین کے مطابق نیل مت پران کا زمانہ عیسیٰ سے قبل کا زمانہ ہے۔

[3] ڈاکٹر وید کماری گئی: نیل مت پران جلد اول ص ۱۱۶

[4] ایضاً

میں مرصع کاری اور مشک باری کی تفصیل ملتی ہے۔ مثلاً یہ کہ لوگ جسم کی مالش خوب کرتے تھے۔ جسم کو ملائم بنانے کے لیے مالش کے عمل کو "ادورتنہ" خوشبو سے تر کرنے کو "اتسادھنہ" اور نہانے کے بعد صندل کی لیپ کو ملنے کے لئے "انولیپنہ" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔[1]

زیر بحث زمانہ میں زمانہ حال کی طرح پوجا میں اناج کی مختلف اقسام استعمال ہوتی تھیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی خوراک بھی سب چیزیں تھیں۔ ان میں سے خاص طور پر دالوں اور ترکاریوں کا ذکر آیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس دور میں گوشت کا استعمال ہوتا تھا۔ ڈاکٹر وید کماری رقمطراز ہیں۔

"گمان ہے کہ گوشت بھی خوراک کا اہم جز تھا۔
ورنہ بھگوان وشنو سے منسوب کئے ہوئے پانچ
دنوں میں گوشت کے استعمال پر زبردست ممانعت
کی ضرورت نہ تھی۔ حتیٰ کہ ایک جگہ پر وشنو کی مورتی
کی پوجا جانوروں کے گوشت کی آہوتی دے کر
بیان کی گئی ہے۔"[2]

نیل مت پران میں خوراک کی ایک طویل فہرست درج ہے۔ چند ایک چیزیں یوں ہیں:۔

اجیہ (خالص مکھن) اپوپا (گھی میں بنا ہوا چاول یا جو کا کیک)
ددہی (دہی) دھانیہ (دھان) دراکھشا (انگور) گرتا (خالص مکھن) گڑسا
گھرتہ پیاسہ (چاول، مکھن، دودھ سے بنا ہوا ایک قسم کا دلیہ)
داڑیما (انار) اکشو، پھنٹ، گڑا، کھنڈ، سرکارا، اکسورس، ستوپالا، گڑی وغیرہ

---

[1] ڈاکٹر وید کماری گئی:۔ نیل مت پران جلد اول ص ۱۱۷ - ۱۱۸

[2] ایضاً ص ۱۱۹

(شکر اور شکر رس سے بنی ہوئی کھانے پینے والی مختلف چیزیں) لون (نمک)
اسی طرح دوسری اشیاء میں الاکتا کا (پیروں کے رنگنے کے لئے لال رنگ) چندن
(صندل) گرد کانا (نہانے کے بعد استعمال کیا جانے والا پیلا رنگ) مدھو (شہد) پالن
(عام قسم کی شراب) مدھیا (شراب) کم کم (کیسر) سوم (دیوتاؤں کی شراب)
کے نام قابل ذکر ہیں۔ نیل مت پران میں ایسی اور بھی بیسیوں اشیاء کے نام گنوائے
گئے ہیں جن میں کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ خوشبوئیں، مصالحہ جات وغیرہ شامل
ہیں۔

رقص، موسیقی، ناٹک اور دوسرے فنون لطیفہ سے قدیم کشمیریوں کی دلچسپی ان
کی کشادہ ذہنی، خوش مذاقی اور عادات و آداب کی خوش مزاجی پر دال ہے۔ نیل مت
کا مطالعہ بتاتا ہے کہ سرزمین کاشمیر کی فضا زمانہ قدیم میں بھی خوش طبع اور خوش مزاج لوگوں
سے معمور تھی۔ مذہبی، نیم مذہبی اور عوامی زندگی سے تعلق رکھنے والی تقریبوں پر موسیقی
کا خاص دخل تھا۔ حتیٰ کہ نئی برف باری یا کھیتوں میں بیج بونے کے وقت آس پاس
کی فضا موسیقی کی رسیلی لہروں سے جھوم اٹھتی تھی۔ نیل مت پران کے حوالے سے ڈاکٹر
وید کماری کا یہ بیان ملاحظہ ہو:

> "بھگوان وشنو کے آرام یا عالم بیداری کے سماں
> کی خالص مذہبی تقریب ہو، نیکمبھ کی آمد یا وداع
> کی نیم مذہبی تقریب ہو یا پھر نئی برف باری یا نئے
> بیج بونے کی موسمی تقریب — موسیقی کا ہر وقت
> بڑا دخل ہے، گانے کا بھی اور بجانے کا بھی۔"[1]

---

[1] ڈاکٹر وید کماری گھئی: نیل مت پران جلد اول ص ...

موسیقی کے ساتھ ساتھ عوامی زندگی میں رقص کی بڑی اہمیت تھی۔ مذہبی تقاریب سے قطع نظر روزمرہ کی زندگی میں رقص کا بڑا دخل تھا۔ موسم بہار کا استقبال رقص سے ہوتا تھا۔ اسی طرح زراعت سے متعلق جتنی تقریبیں ہوتی تھیں رقص کے بغیر نامکمل تھیں۔ ذکر ہو چکا ہے کہ رقص و موسیقی سے کشمیریوں کی دل چسپی کا حال ہارون کی اینٹوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف مردوں کا ہی میدان نہیں تھا بلکہ عورتیں بھی اس فن کی ماہر تھیں اور برابر اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھیں۔ کلہن، کھیمندر اور بلہن نے بھی اپنی تحریروں میں رقص کے ساتھ خواتین کی وابستگی اور دل چسپی کا ذکر بار بار کیا ہے۔ کلہن نے مندروں کے ساتھ رقاصاؤں کے تعلق کا بھی ذکر کیا ہے۔ واسوگپت کے فلسفیانہ سوتروں میں اسی فن کی بنیاد پر تشبیہات کا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ آتما کو رقص، انترآتما کو تھیٹر اور اندریوں کو تماشائی کہتا ہے[۱]۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ موسیقی کا تعلق زیادہ تر لوک سنگیت کے ساتھ تھا۔ مذہبی تیوہاروں پر جس طرح کے رقص ہوتے تھے وہ عام طور سے دیوتاؤں سے متعلق ہوتے تھے۔ باقی تقاریب پر ہونے والے رقص عوامی زندگی سے تعلق رکھتے تھے۔ نیل مت پران میں مصوری کا ذکر آیا ہے۔ کشمیری پنڈتوں کے یہاں آج بھی شادی بیاہ کے موقعوں پر دائرے کی شکل میں رنگوں کا جو منڈل آنگن میں بنایا جاتا ہے اور جسے "دیوگ" کہا جاتا ہے اسی زمانہ کی یادگار ہے اور "بھومی سوبھا" سے اخذ کیا ہوا ہے جس کا ذکر نیل مت پران میں کیا گیا ہے[۲]۔

دیگر فنون میں بھی اہل کشمیر کسی دوسری قوم سے کم تر نہ تھے۔ یہ لوگ فن تعمیر سے واقف تھے۔ چناں چہ نیل مت پران میں مندروں، مکانوں، سڑکوں، چوراہوں

۱۔ ڈاکٹر وید کماری گئی: نیل مت پران جلد اول ص ۹۹

۲۔ ایضاً ص ۱۱۵

وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی یہ لوگ دسترس رکھتے تھے۔ یہ لوگ کپڑے کی کتائی، بنائی، رنگائی، دھلائی سے بھی جانکاری رکھتے تھے۔ ان کو زیورات پہننے کا شوق تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں طاق تھے۔ وہ میدان جنگ میں استعمال کئے جانے والے ہتھیار بنانا جانتے تھے۔ اسی طرح مٹی، چمڑے اور لکڑی کی مختلف چیزیں بھی بنانا جانتے تھے۔ یہاں مویشیوں کی خاصی تعداد ملتی تھی۔ جن میں گائے، گھوڑے ہاتھی اور بیل وغیرہ شامل تھے۔ بار برداری کے کام میں گھوڑوں، بیلوں اور گائیوں کی بڑی افادیت تھی۔ لہٰذا مذہبی اعتبار سے ان کی بڑی اہمیت تھی اور "گرسے رسمبھا" رسومات سے ان کی پوجا ہوتی تھی۔[1] کشمیری پنڈتوں کے یہاں اس رعایت سے گائے یا بیل کا دان موت کی رسومات میں شامل ہے۔ جس کے اعتبار سے موت کے بعد "یم لوک" کو پار کر کے سورگ کے راستے کو پایا جا سکتا ہے۔ کشمیری پنڈتوں میں آج بھی کھانا کھانے سے پہلے کتوں اور کوؤں کا حصہ الگ رکھ دینے کا رواج ہے۔ حتیٰ کہ کوؤں کا جنم دن ہر سال ماگھ شکلہ پکش کی پورنماشی (ماگھ کے روشن پندرھواڑہ کی پندرھویں) کو منایا جاتا ہے۔ جسے "کاؤ پنتم" کہا جاتا ہے۔[2]

---

[1] ڈاکٹر وید کماری گئی، نیل مت پران جلد اول ص ۱۲۵

[2] بہت سارے تیوہار اب آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آنے والی نسل ان کا ذکر صرف تواریخوں میں پڑھے گی۔ کاؤ پنتم ایک ایسا ہی تیوہار ہے۔ ماگھ پورنماشی کو ہر سال کوؤں کی سالگرہ بڑے چاؤ سے منائی جاتی تھی۔ ہر پنڈت گھر میں پر پھیلائے ہوئے کوے کا پتلہ لکڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنایا جاتا تھا۔ بچوں کے لئے خاص طور سے ہنسی مذاق کا وقت ہوتا تھا۔ وہ اپنی ننھی منی آوازوں سے میاں "کاگے" کو پکارتے تھے اور دعوت شیراز میں شریک ہونے کی درخواست کرتے تھے۔ چاروں طرف فضا میں گونجتی آوازوں کا زیر و بم سنا جا سکتا تھا۔

(باقی اگلے صفحے پر)

ہندو عہد

کافی زمانہ بیت جانے کے بعد ساتویں صدی عیسوی میں چینی سیاح ہیون سوانگ ہندوستان کی سیاحت کے لئے آیا۔ کشمیر میں اس کا قیام لگ بھگ دو سال (۶۳۲-۶۳۳ء) تک رہا۔ اس نے اپنے مشاہدے کی بنیاد پر جو یادداشتیں اپنی کتاب میں درج کی ہیں ان میں شمالی ہندوستان کے ملبوسات کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

"جہاں ہوا خنک ہے۔

مرد اپنے لباس کو جسم کے درمیان میں لپیٹ لیتے ہیں پھر اسے اپنی بغلوں کے بیچ میں سے نکال کر اپنے جسم پر دائیں طرف لٹکا دیتے ہیں۔ عورتوں کا لباس نیچے زمین تک لٹکا رہتا ہے اور ان کے کندھے ڈھک جاتے ہیں۔ لوگ سروں پر ٹوپیاں پہنتے ہیں جن کے ساتھ مالائیں اور جواہرات سے سجے ہوئے گلے کے زیور بھی ہوتے ہیں۔"[1]

---

* (بقیہ حاشیہ) اس ہماری میاں کا گے!
کھڑی کے رسیا کاگے!
گنگابل کے پانیوں سے نہا کر!
لال مٹی کا تلک لگا کر آ!
آ! ہمارے نئے گھر کی منڈیر پہ بیٹھ جا
اور ہماری دعوت میں شریک ہو جا

(ب۔ پ)

[1] بحوالہ پی این کے بامزئی، ہسٹری آف کشمیر ص ۲۲۷

مورخ حسن نے بھی دورِ قدیم کی پوشاک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لوگ تین لباس پہنتے تھے جن میں کرتہ، پاجامہ، درمہ، کاژن، لونگی شامل تھا[1]۔ درمہ کی وضاحت کرتے ہوئے حسن نے لکھا ہے کہ یہ ساخت یا آٹھ گز لمبا اور آدھ گز چوڑا مالیدہ پٹو ہوتا تھا۔ جس کا پہلا پیچ سر پر دوسرا پیچ ہاتھوں پر اور تیسرا پیچ زیر بغل ہوتا تھا اور لپیٹ کر سر سے گردن پر لٹکے رہتے تھے۔ گمان غالب ہے کہ یہی پوشاک ہوگی جس کا ذکر ہیون سانگ نے کیا ہے۔ حسن نے "کاژن" کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ مہین پٹو ہوتا تھا جو دس یا بارہ گز لمبا اور پانچ یا چھ گنا چوڑا ہوتا تھا اور سر پر باندھا جاتا تھا۔ جس لنگے کا ذکر آگے ہوا ہے اسے حسن نے پیشوا کی طرح کی پوشاک بتایا ہے[2]۔

اس بیان میں ملبوسات کا جو ذکر ملتا ہے۔ اس کی تصدیق کارکوٹ عہد میں بھی ہوتی ہے۔ کلہن کے مطابق اس زمانہ میں لوگ ایک لمبا چغہ پہنتے تھے۔ جو گندھوں سے ٹخنوں تک لمبا ہوتا تھا۔ یہ چغہ کمر بند کی مدد سے کمر کے ارد گرد بندھا رہتا تھا۔ وہ نیم آستینوں والا جیکٹ یا بلاوز بھی استعمال کرتے تھے[3]۔ غریب لوگ سردی کی وجہ سے موٹا کمبل اور فارغ البال طبقہ عمدہ کمبل استعمال کرتا تھا۔ یہ اس قدر ڈھیلا ڈھالا ہوتا تھا کہ اس میں آسانی سے کانگڑی[4] کو تاپا جا سکتا تھا۔ پاؤں میں لکڑی کے کھڑاؤں استعمال ہوتے تھے اور امرا موروں کی شکل والے جوتے پہنتے تھے۔ چمڑے کے جوتے بھی استعمال ہوتے تھے۔ ہندو دور کے آخری راجے سفید رنگ کی پگڑی کا استعمال کرتے تھے۔ عورتیں زیورات کی شوقین تھیں اور گلے کا ہار، کنگن، بازوبند

---

1. حسن: تاریخ حسن جلد اول ص ۵۲
2. ایضاً
3. کلہن: راج ترنگنی جلد اول (مترجمہ ارل سٹین) مکرر اشاعت ۱۹۷۹، ص ۴۰۳
4. کانگڑی کا قدیم نام کاستھان گار یکا بتایا جاتا ہے

اور بالیاں استعمال کرتی تھیں۔ راجہ ہرش زیورات کا دلدادہ اور رنگین مزاج تھا۔ اس نے نہ صرف اپنے لئے بلکہ اپنے درباریوں اور اپنی رانیوں کے لیے بھی زیورات کے نئے نئے فیشن رائج کئے تھے۔[۱] ایسے زیورات میں ماتھے کا جھومر اور بالوں کی چوٹی میں باندھا جانے والا سنہری دھاگا بھی شامل تھا۔

ہندو دورِ حکومت میں چاول کو خوراک میں بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ چاول کو کئی طرح سے پکایا جاتا تھا۔ راج ترنگنی میں تلخ ذائقہ والے اتپل ساگ (اوپل ہاکھ) کا ذکر آیا ہے[۲] جو پہاڑی ڈھلوانوں پہ اگتا تھا اور جسے غریب لوگ استعمال کرتے تھے۔ انگور، خوبانی اور ناشپاتی شوق سے کھائے جاتے تھے۔ پیاز کا استعمال ہوتا تھا۔ کھشمندر کے مطابق نمک صرف امراء استعمال کرتے تھے کیونکہ یہ کافی دور سے لایا جاتا تھا اس لئے مہنگا بھی ہوتا تھا۔ عام لوگ اسے خرید نہیں سکتے تھے۔ گوشت کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ صرف کبوتر اور گائے کا گوشت کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ گوشت عموماً بھون کر کھایا جاتا تھا اور اسے خوب مرچ مصالحہ میں تیار کیا جاتا تھا۔ مچھلی کا استعمال خوب ہوتا تھا اور اس کا شوربہ پسند عام تھا۔ شراب کا استعمال ہوتا تھا۔ انگور کا رس شراب میں کشید کیا جاتا تھا۔ شراب ٹھنڈی کی جاتی تھی اور اسے پھولوں کی خوشبو سے معطر کیا جاتا تھا۔ امراء میں پان کھانے کا رواج تھا۔ کلہن نے ایک طرح کے کانوڑ "پوٹیا" کا بھی ذکر کیا ہے۔ کشمیری زعفران کی مانگ سارے ہندوستان میں تھی۔

اس زمانے میں راجاؤں، رانیوں اور درباریوں نے کئی قصبے اور شہر آباد کئے۔ سال کے بیشتر دن سردیوں کی نذر ہو جاتے تھے۔ اس لئے سردی سے بچنے کے لئے

---

[۱] بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۲۳۸

[۲] کلہن: راج ترنگنی جلد اول ص ۱۹۵

مکانوں کی خاصی تعداد تعمیر ہوتی رہتی تھی۔ راجاؤں کے لئے بڑے بڑے محل اور حویلیاں بنتی تھیں۔ عام لوگ لکڑی کے مکانات اور جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ غریب اور بے گھر لوگ مندروں، استھوں اور وہاروں میں بھی رہتے تھے۔ دوسری جگہوں سے آنے والے طلبا کے لئے بورڈنگ ہاؤس موجود تھے۔ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ ما قبل تواریخ کے دور میں لوگ گڑھوں میں رہتے تھے جن پر گھاس کی چھتیں ہوتی تھیں۔ لیکن زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ مکانوں کی ہیئت میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ حتیٰ کہ پرواسین دوئم (چھٹی صدی عیسوی) کے عہد میں جب موجودہ سرینگر کی بنیاد ڈالی گئی تو سربفلک عمارتوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا۔ بامزئی کے مطابق اس زمانہ میں کشمیر اپنی پانچ خصوصیات کے لئے مشہور تھا اور ان میں سے ایک خصوصیت یہاں کے عظیم الشان مکانات تھے[1]۔ امراء کے مکانات ایک چوکور کی شکل میں ہوا کرتے تھے۔ بیچ میں صحن ہوا کرتا تھا۔ سواری کا سب سے اہم ذریعہ گھوڑا تھا۔ اس زمانے میں "پہیئے" کا کوئی تصور نہیں تھا اس لئے انیسویں صدی تک پہیوں پر چلنے والی گاڑی سے ملتی جلتی کوئی چیز نہیں ملتی، البتہ وتستا میں کشتیوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ کا سفر کیا جاتا تھا۔

ہندو دور میں عورتوں کی بڑی سماجی اہمیت تھی۔ امیر طبقہ کی خواتین ہر طرح کی تعلیم و تربیت سے آراستہ ہوتی تھیں۔ کھیمندر کے مطابق عورتیں پراکرت روانی سے بولتی تھیں[2]۔ غریب طبقہ کی عورتیں مقامی بولی میں گفتگو کرتی تھیں۔ پردے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی تھیں۔ گھر میں ہوں، میدان جنگ میں ہوں یا کھیتوں میں وہ مرد کا برابر ہاتھ بٹاتی تھیں۔ سماج میں انہیں عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بیواؤں کی شادی کا رواج تھا۔ امراء کے طبقہ میں ستی کا

---

[1] بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۲۲۹

[2] پی۔ این۔ کے بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۲۰۲

رواج بھی تھا لیکن عام لوگ اس کے پابند نہ تھے راجا اور امراء ایک سے زیادہ عورتوں کے ساتھ شادی کر سکتے تھے۔ سماج میں طوائفوں کا بھی ایک طبقہ تھا۔ مندروں کے ساتھ دیو داسیوں کی خاصی تعداد وابستہ رہتی تھی۔ سیاست میں عورتوں کا کافی دخل تھا۔

اسلامی عہد

چودھویں صدی عیسوی سے اسلامی عہد کی شروعات ہوتی ہیں۔ کلہن کے مطابق ہرش کے زمانہ (گیارہویں صدی) سے قبل لوگوں کے بال بڑے ہوئے ملتے ہیں۔ اس لئے سر کو ڈھانپنا ضروری بنتا تھا۔ بامزئی کا خیال ہے کہ ہرش نے گندھار اور پنجاب کے مغربی علاقوں کے اسلامی اثرات کے تحت پگڑی اور چھوٹے سائز کے کوٹ کو رواج دیا[1] لیکن صوفیائے کرام اور اسلامی مفکرین کے آنے کے بعد کشمیریوں نے لمبے چوغے اور گول پگڑی کا استعمال سیکھا یہ لباس عام طور سے سوتی یا اونی کپڑے سے تیار ہوتا تھا۔ لیکن خاص خاص موقعوں پر امیر طبقہ کے لوگ ریشمی کپڑے کا استعمال بھی کرتے تھے۔ اس دور میں امراء کا لباس کم وبیش وہی تھا جو عرب، ایران اور ترکستان میں استعمال ہوتا تھا۔ محب الحسن کے مطابق اس طرح کے لباس کی شروعات سید علی ہمدانی رح نے سلطان قطب الدین کے زمانے میں کرائیں اور سلطان سکندر بت شکن کے زمانہ تک آتے آتے کشمیری برہمنوں نے بھی اسی لباس کو اپنانا شروع کیا تھا۔[2] شلوار اور قمیض کے ساتھ ساتھ صدری پہننے کا رواج ہو گیا اس کے اوپر ایک چوغہ پہنا جاتا تھا۔ سر پر ایک ٹوپی ہوتی

---

[1] پی، این، کے بامزئی۔ ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۱

[2] MOHIBUL HUSSAIN: KASHMIR UNDER THE SULTANS P228

تھی جس پر پگڑی باندھی جاتی تھی۔ قاضی اور علماء سیاہ رنگ کی پگڑی استعمال کرتے تھے[1]۔ غریب لوگ پاجامہ یا شلوار کے مانند کی کوئی چیز استعمال نہیں کرتے تھے۔ البتہ ٹوپی ضرور استعمال ہوتی تھی۔

اس دور کے آغاز میں جس طرح کے لمبے چوغے کا استعمال ہونے لگا اس نے بعد میں "پھرن" کی صورت اختیار کر لی۔ جسے آج تک کشمیری متاع عزیز سمجھتے ہیں۔ سماج کے مختلف طبقوں میں استعمال کئے جانے والے لباس میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔

عورتوں کا لباس مردوں سے قدرے مختلف تھا۔ عورتوں میں پاجامہ پہننے کا رواج تھا۔ لیکن ان کی ٹانگیں اکثر برہنہ رہتی تھیں[2]۔ مسلمان عورتیں سر پر "کسابہ" اور پنڈت خواتین "ترنگہ" استعمال کرتی تھیں۔ مغلوں کے آنے کے بعد "پھرن" (جو[3] بعض لوگوں کے مطابق پیراہن کی بگڑی ہوئی صورت ہے) کے استعمال پر اصرار ہوا اور کانگڑی کا استعمال بھی شد و مد سے ہونے لگا۔ تاکہ کشمیریوں کی شجاعت جوش اور ولولہ ختم کیا جائے[4]۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لباس کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ لباس کا یہ فرق شاہ جہاں کے عہد حکومت سے ہونے لگا[5]۔ اس دور میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں نے ہندوؤں کی تہذیب اور آداب

---

۱ MOHIBUL HUSSAIN : KASHMIR UNDER THE SULTANS P.228

۲ DR. R.K. PARMU : A HISTORY OF MUSLIM RULE IN KASHMIR PAGE 448

۳ پھرن سنسکرت پروارنہ کی بگڑی ہوئی صورت بتائی جاتی ہے۔ جو پروارنہ سے پھروانہ اور پھر پھرن ہو گیا۔

۴ پی این کے بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۲

۵ DR. R.K. PARMU : HISTORY OF MUSLIM RULE IN KASHMIR P. 448

زندگی کو متاثر کیا۔ اسلام کی آمد کے بعد اور تبدیلیٔ مذہب کے باوجود عام لوگ اپنے ماضی کو فراموش نہ کر سکے اس لئے اسلامی عہد میں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے ساتھ ساتھ ہندو تیوہار بھی اسی شان و شوکت سے منائے جاتے تھے۔ ہندوؤں کے مقدس مقامات کو احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ اہل اسلام بعض اوقات مورتیوں کی پوجا بھی کرتے تھے[۱] تواریخی شواہد سے بات بالکل عیاں ہے کہ اکثر سلاطین بڑے روادار تھے اور ہندو تیوہاروں میں بڑے خلوص اور عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ اکثر سلاطین نے ہندو عورتوں کے ساتھ شادیاں رچائی تھیں۔ جو نہ صرف اپنے عقاید پر کاربند تھیں بلکہ ان کے اثرات اپنے شوہروں اور بچوں پر واضح تھے اتنا ہی نہیں بلکہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی بہت سی ضعیف الاعتقادیاں بھی حاصل کر لی تھیں۔ مثلاً دم دار تارے کو دیکھنا، کتے کے بھونکنے کی آواز کو سننا، دن میں الو کا بولنا، سانپ کا راستہ کاٹ کر گزرنا وغیرہ تباہی کی علامات سمجھی جاتی تھیں[۲]

کڑاکے کی سردی کے باعث لوگ بہت کم نہاتے تھے۔ اس بدعت کو ختم کرنے کے لئے مرزا حیدر دوغلت نے مسجدوں میں حمام کی شروعات کروائیں جہاں نہانے دھونے کے لیے گرم پانی مہیا ہوتا تھا[۳] لوگ عام طور سے مفلوک الحال تھے۔ اس لئے ان کے پاس کپڑوں کی قلت رہا کرتی تھی۔

۱۔ MOHIBUL HUSSAIN: KASHMIR UNDER THE SULTANS PAGE 440

۲۔ MOHIBUL HUSSAIN: KASHMIR UNDER THE SULTANS PAGE 440

۳۔ بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۲

بامزئی نے تزک جہانگیری کے حوالے سے لکھا ہے:-

"اپنے افلاس کے باعث کشمیری ایک سے زیادہ
پھرن نہیں رکھ سکتے اس کو صرف اسی وقت
تبدیل کیا جاتا ہے جب یہ بالکل ناقابل استعمال
ہو جاتا ہے۔" [۱]

زیورات کا استعمال برابر ہوتا تھا۔ سلاطین اور مغلوں کے عہد میں زیورات کے ڈیزائین میں البتہ تبدیلی رونما ہوئی۔ صوفی نے زیورات کے ڈیزائین میں تبدیلی لانے کا سہرا ملکہ نور جہاں کے سر باندھا ہے۔[۲] عام کشمیریوں نے مغل زیورات کی نقل کی۔

خوراک کی مد میں چاول کو اہمیت تھی جسے کئی طریقوں سے پکایا جاتا تھا۔ ایرانی اثرات کے تحت کئی طرح کے پلاؤ پکتے تھے جو امراء کا من پسند کھانا تھا۔ غریب لوگ گندم اور جو کا استعمال کرتے تھے۔ مچھلی، انڈے، گوشت اور سبزیوں کا رواج تھا۔ مغلوں نے گشتابہ، کباب، روغن جوش کا اضافہ کیا۔ شراب کا استعمال ہوتا تھا۔ بھنگ اور افیم جیسی نشہ آور چیزیں بھی استعمال ہوتی تھیں۔ نمکین چائے اور قہوے کا رواج تھا۔ تفریح طبع کے لئے کئی مشاغل تھے۔ پولو کھیلنے کا عام رواج تھا۔ اس کو چوگان کہتے تھے اور غالباً گلگت کے ساتھ تعلقات کی بنا پر اس کا رواج ہو چلا تھا۔ امراء شکار کے شوقین تھے۔ شکرے پرندوں کو آسمان کی بلندیوں سے مار گرا کر اپنے مالک کے پاس لے آتے تھے۔[۳] شکاری لوگ جھیلوں کے کنارے کشتیوں میں

---

[۱] بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۲

[۲] صوفی: کشیر جلد دوئم ص ۵۸۱

[۳] MOHIBUL HASSAN: KASHMIR UNDER SULTANS PAGE - 231 - 232

بیٹھ کر یہ نظارہ دیکھتے تھے اور بہت پسند کرتے تھے۔ عام لوگ ہاکی کھیلتے تھے[1] دوسرا کھیل جنگ سے متعلق تھا۔ جمعہ کو سری نگر کے کسی بھی علاقے کے لوگ دوسرے علاقے کے لوگوں کو للکارتے تھے۔ جگہ اور وقت مقررہ پر لاٹھیاں چلتی تھیں۔ خوب سر پھٹول ہوتا تھا اور لوگ زخمی ہو جاتے تھے[2] شعبدہ بازی، تیر اندازی اور تیغ زنی کا بڑا چلن تھا۔ موسیقی کافی مقبول تھی بڈشاہ کے عہد میں خاص طور سے موسیقی کی محفلیں منعقد ہوا کرتی تھیں۔ لوک گیتوں ڈراموں اور شعر وسخن کی مجلسیں ذوق و شوق سے منعقد ہوتی تھیں۔ 'بھانڈ پاتھر' کو بڑے شوق سے دیکھا جاتا تھا۔ بہادری دکھانے کے کرتب تو تھے ہی۔ اس لئے کشتی بازی، ماہی گیری، کبوتر بازی، گھوڑ سواری، بازوں کی جنگ وغیرہ عام تھی۔ مقامی اثرات کے باعث جشن عزیب لوگ بھی مناتے تھے۔ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں دریائے جہلم میں "تخت رواں" پر، شالیمار، ویری ناگ اور اچھہ بل میں جشن مناتے تھے۔[3]

اس دور میں شاندار عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ لکڑی بافراط ملتی تھی۔ اس لئے مکانات عام طور پر لکڑی کے تعمیر ہوتے تھے۔ مکانات چار چار پانچ پانچ منزلہ ہوا کرتے تھے۔ چھتیں ڈھلوان ہوتی تھیں تاکہ برف سرک کر آسانی سے نیچے گر سکے۔ بھوج پتر پر مٹی کی موٹی تہیں لگ جاتی تھیں۔ جن پر رنگ برنگ کے پھولوں کی بہار ہوتی۔ دیہاتی مکانوں کی چھتیں گھاس پھوس کی ہوتی تھیں۔ اچھے اچھے مکان عام طور سے دریا کے کنارے تعمیر ہوتے تھے۔

۱۔ MOHIBUL HASSAN: KASHMIR UNDER SULTANS PAGE 231 232

۲۔ ibid PAGE 232

۳۔ DR. R.K PARMU: A HISTORY OF MUSLIM RULE IN KASHMIR P. 449

بار برداری میں خچر استعمال ہوتے تھے۔ بڑے بڑے مرغزاروں میں گھوڑے پالے جاتے تھے۔ بیگار کا رواج تھا۔ سب سے اہم سواری انسانی پیٹھ تھی۔[1] کشتی رانی ہوتی تھی۔ اندرونی تجارت کے لیے کشتیاں استعمال ہوتی تھیں۔ عورتوں کا درجہ وہی تھا جو ہر ایسے سماج میں ہوتا ہے جہاں مردوں کی بالادستی ہوتی ہے۔ عورتیں عام طور سے گھروں میں رہتی تھیں البتہ غریب گھرانوں کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ امیر گھرانوں میں عربی، فارسی اور دینی تعلیم کا رواج تھا۔ غریب عورتیں زیورِ علم سے عموماً آراستہ نہیں ہوتی تھیں۔ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا تھا۔ ہندو دور کے مقابلہ میں اس زمانے میں عیاشیوں کے مواقع کم تھے۔

سکھ عہد

کشمیر میں سکھ عہد صرف ۲۷ سال رہا اس عرصہ میں وہ عام طور پر فوجی کارروائیوں میں مصروف رہے اس لیے لوگوں کے معیارِ زندگی میں کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی لوگوں کا لباس اور ان کا رہن سہن بالکل معمولی قسم کا تھا۔ مرد اور عورتیں لمبا اور ڈھیلا ڈھالا پھرن استعمال کرتی تھیں۔ لوگوں کی معاشی حالت ابتر تھی۔ افلاس کے مارے ہوئے لوگ اکثر پھٹے پرانے چیتھڑوں میں ملبوس نظر آتے تھے۔[2] طبقہ امراء بارسوخ سکھوں اور پنڈتوں پر مشتمل تھا جو عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ لوگ جب گھومنے پھرنے یا سیر کو چلے جاتے تو نوکروں کی پوری فوج دائیں بائیں رہتی۔ سیر و سیاحت اکثر و بیشتر کشتیوں میں ہوتی تھی جن کو مردوں کے علاوہ

---

[1] بامزئی، ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۹

[2] ایضاً ص ۶۲۷

خوبصورت عورتیں کھیتی تھیں۔ ان کی کلائیوں پر گھنگرو کی طرح کا کوئی زیور بندھا رہتا تھا۔ جو چپو چلاتے وقت مدھر آواز کا سنگیت جگاتا تھا۔[1]

حسن کے مطابق اس سے قبل کے دور میں پٹو کے دُرّے کا رواج تھا اور اس عہد میں معدوم ہو چکا تھا اور اس کے بجائے چادر کا رواج ہو چلا تھا۔ گرمیوں میں لٹھے کی چادر استعمال ہوتی تھی۔[2] پگڑی میں تبدیلی آچکی تھی۔ حسن کا خیال ہے کہ دونوں فرقوں میں لباس کا کوئی فرق نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ پنڈتوں کا پیرن چوڑی دار، دراز آستینوں والا ہوتا تھا۔ پاجامہ چُست ہوتا تھا۔ یہ لوگ ایک فٹ عرض والی بیس گز لمبی پگڑی باندھتے تھے۔ ایک یا دو حصوں والی پٹو یا پشمینہ کی چادر استعمال ہوتی تھی۔[3] کشمیری پنڈتوں کا عام پیشہ منشی گیری تھا۔ اس لئے ان کی کمر میں کپڑے کا کمربند ایک (لونگی) بندھا رہتا تھی جس کے ساتھ قلمدان بھی بندھا رہتا تھا۔ عام پنڈتوں کی حالت مسلمانوں ہی کی طرح ناگفتہ بہ تھی۔ اس کا اندازہ بزلس لگایا جاسکتا ہے۔

"وہ شاذ ہی اپنے کپڑوں کو تبدیل کرتا تھا۔ یہ کوئی اچنبے کی بات نہیں تھی کہ یہ دو ایک دن کی چھٹی کی درخواست دیتا تھا۔ جو اس کے حق میں منظور ہوتی تھی تاکہ وہ اپنے پیرن اور پگڑی کو دھو سکے۔"[4]

---

۱ بازئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۲۲۷

۲ حسن کھویہامی: تاریخ حسن حصہ اول ۴۵۳

۳ ایضاً

۴ پی، این کے بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۴۳۸

متوسط طبقہ کے لوگ کھانے میں چاول، گوشت، مچھلی اور سبزی ترکاری استعمال کرتے تھے۔ عام لوگوں کی معاشی حالت ابتر تھی۔ وہ سنگھاڑے اور ندرو کھا کر گزارہ کرتے تھے۔ بامزئی نے مورکرافٹ کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس دور میں تقریباً تیس ہزار لوگ پانچ ماہ تک سنگھاڑہ اور پانچ ہزار افراد آٹھ ماہ تک صرف ندرو کھاتے تھے[1] مکانات کھنڈر ہو چکے تھے۔ تعمیر و ترقی کی طرف کوئی دھیان نہیں تھا۔ بیشتر لوگ بھیک مانگتے تھے۔ کسانوں کی حالت مزید ناگفتہ بہ تھی۔ وہ ریاست سے باہر جا کر مزدوری کرتے تھے اور "ہاتو" کہلاتے تھے کار بیگار یا لام کا سلسلہ، جو قدیم وقتوں سے چلا آرہا تھا، اب تک قائم تھا[2] لیکن اس کا بوجھ شہریوں کے بجائے دیہاتی لوگوں کو زیادہ برداشت کرنا پڑتا تھا۔ عورتوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی جارہی تھی۔ گھر گرہستی کے علاوہ ان کا کام چرخہ کاتنا بھی تھا۔ افلاس کے مارے ہوئے لوگ اپنے بچوں کو فروخت کرتے تھے۔[3]

ڈوگرہ عہد

ڈوگرہ عہد میں بھی عورتوں اور مردوں کے لباس میں بہت کم فرق تھا۔ پھیرن کا رواج حسب معمول موجود تھا۔ مرد پگڑی باندھتے تھے۔ فیشن پرست لوگ پگڑی کو اپنے سر کے پچھلے حصے پر اس طرح باندھتے تھے کہ پیشانی کا خاصا حصہ کھلا رہے۔ عورتیں لمبا پھیرن پہنتی تھی۔ مسلمان خواتین کا پھیرن

---

[1] پی۔ این۔ کے بامزئی: ہسٹری آف کشمیر ص ۶۳۸

[2] R.K. PARIMU: A HISTORY OF SIKH RULE IN KASHMIR P.308

[3] P.308 ibid

نسبتاً کم لمبا ہوا کرتا تھا۔ کنواری اور بیاہتا عورتوں کے پھرن ایک دوسرے سے مختلف ہوتے تھے۔ بیاہتا پنڈت خواتین کے پھرن کے دامن اور گردن کے کناروں پر ایک بورڈر لگتا تھا جسے "ڈور" کہا جاتا تھا۔ آستین کھلی اور چوڑا ہوتی تھی۔ سہاگن پنڈتانی کے پھرن کی آستین پر ایک حاشیہ استعمال ہوتا تھا جسے "نروار" کہا جاتا تھا۔ بیوہ ہو جانے پر "نروار" ہٹا دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد عام طور سے وہ رنگین کپڑے کا استعمال بھی نہیں کرتی تھی۔ پھرن کی جیب بائیں طرف ہوتی تھی۔ مردوں اور مسلمان خواتین کے پھرن کی جیب دائیں طرف ہوتی تھی۔ ترنگہ اور کسابہ کا رواج تھا۔ پنڈتانیوں کے ترنگہ کے ساتھ ایک ڈوپٹے کا استعمال لازمی تھا جسے "پوٹز" کہا جاتا تھا۔ یہ "پوٹز" کچھ اس طرح استعمال ہوتی تھی کہ اس کا جو حصہ سر پر رہتا تھا وہ ایک پھن پھیلائے ہوئے سانپ کے مانند ہوتا تھا۔ قیاس غالب ہے کہ لباس کا یہ طرز بہت قدیم ہے اور اپنے اندر ناگ اثرات لئے ہوئے ہے۔ پھرن پر پنڈتانیاں ایک کمربند باندھتی تھیں جسے "لونگی" کہا جاتا تھا۔

گھر کے باہر کشمیری پنڈت خواتین اپنے سر اور چہرے کے نصف حصے کو ایک باریک ڈوپٹے سے چھپا لیتی تھیں اور سردیوں میں موٹا اونی یا رفل کا کپڑا استعمال ہوتا تھا جسے "وڈیو" کہا جاتا تھا۔ ساڑھی کا رواج بیسویں صدی کے تیسرے دہے میں ہوا۔ جب جہیز کے خلاف مہم چلائی گئی اور "لونگ بُوڑہ" مردہ باد کا نعرہ بلند ہوا۔ کشمیری پنڈت خواتین زیورات میں علاوہ دوسری چیزوں کے "ڈیجہور" کا استعمال کرتی تھیں جو کان سے ایک دھاگے یا سونے کی زنجیر سے لٹکا رہتا تھا۔ یہ شادی شدہ عورت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اور اب تک برابر اس کا استعمال ہوتا ہے۔ بالوں کو ایک خاص ڈھنگ سے سنوارا جاتا تھا۔ کنوارپنے

میں لڑکیاں بالوں کی چھوٹی چھوٹی مینڈھیاں گوندھتی تھیں۔ شادی کے بعد بالوں کے اسٹائل میں نمایاں تبدیلی آجاتی تھی ان مینڈھیوں کو کھول کر ایک بڑی چوٹی میں گوندھ دیا جاتا تھا۔ امیر گھرانوں کی خواتین برقع استعمال کرتی تھیں اور اس میں ہندو مسلمان کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ سفر کے دوران پٹو یا اونی کپڑے کو ٹانگوں کے گرد چستی سے لپیٹ لیا جاتا تھا جسے "پاتو" کہا جاتا تھا۔ پاؤں میں چمڑے کا خالص جوتا استعمال ہوتا تھا۔ جسے "پازارہ" کہا جاتا تھا۔ جس کے تلوے میں میخیں لگتی تھیں۔ "پازارہ" کو پائیدار بنانے کے لئے تیل کی مالش کی جاتی تھی۔ چمڑے کے جوتے صرف امرا استعمال کرتے تھے۔ غریب لوگ گھاس کے پولے اکتفا کرتے تھے جس کو "پُل ہور" کہا جاتا تھا۔ لکڑی کے کھڑاؤں عام طور سے استعمال ہوتے تھے۔

لارنس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملبوسات کے فرق کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:-

"پنڈت اپنی سفید پگڑی کو دائیں طرف کے کونے سے اور مسلمان بائیں طرف کے کونے سے باندھتا ہے۔ پنڈت اپنے پھرن کو دائیں اور مسلمان بائیں طرف باندھتا ہے۔ پنڈتوں کے پھرن کی آستین لمبی اور تنگ ہوتی ہے اور مسلمانوں کی چھوٹی ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے امتیاز کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے کیونکہ مسلمان ہمیشہ گھوڑوں پر پیچھے سے سوار ہوتے تھے

ہیں اور ہندو آگے سے"۔[1]

اس دور میں پگڑیوں کے مختلف انداز سے باندھے جانے کی تصدیق بیٹس کے مرتب کردہ گزٹ سے بھی ہوتی ہے[2] مختلف پیشہ ورانہ طبقوں میں پگڑیوں کے مختلف انداز نظر آتے ہیں۔ ٹنڈل بسکو نے ڈوگرہ شاہی کے زمانہ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذارا اور کشمیر کی سماجی زندگی میں بڑی دل چسپی کا اظہار کیا۔ اپنی کتاب "کشمیر ان سن لائیٹ اینڈ شیڈ" میں کشمیر سے متعلق اپنی یادداشتوں کو اس نے قلم بند کیا ہے۔ اس کے مطابق برہمن کی پگڑی میں چونکہ وزن زیادہ ہوتا ہے اس لئے وہ زیادہ بھاری بھر کم ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں ایک ترکھان یا ایک ہانجی کی پگڑی ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے اور اس کی ہیت بھی مختلف ہوتی ہے۔[3] بسکو نے بڑے خلوص کے ساتھ کشمیر کے بارے میں لکھا ہے۔ پھیرن کے حوالہ سے افغانوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> "کہا جاتا ہے کہ جب افغانوں نے کشمیر کو فتح کیا
> تب انہوں نے مردوں کو مجبور کیا کہ وہ عورتوں
> کے مانند لباس پہن لیں کیونکہ یہ ان کے کردار
> کے عین مطابق ہے"۔[4]

بسکو نے کشمیری پگڑی کی بہت سی خصوصیات گنوائی ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہ سر کا تحفظ کرتی ہے اور سر پر کیا ہوا کوئی بھی وار کارگر نہیں ہوتا۔ یہ گرمیوں میں سر کو

---

[1] والٹر لارنس: ویلی آف کشمیر ص ۲۵۳

[2] CHARLES ELLISON BATES: A GAZETTE OF KASHMIR P. 35

[3] C. E. TYNDALE BISCOE KASHMIR IN SUNLIGHT & SHADE P. 188

[4] ایضاً P. 188, 139

سرد اور سردیوں میں گرم رکھتی ہے۔ اس سے درخت پر چڑھنے کے لیے رسی کا کام لیا جاتا ہے اور گھوڑ سواری کے وقت تیز رفتار گھوڑے کو روکا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مسلمان کھلا پاجامہ پہنتے تھے اور کشمیری پنڈت تنگ اور چست پاجامہ استعمال کرتے تھے جسے چکنے کاغذ کی مدد سے پہنا جاتا تھا۔

لارنس کے مطابق رات اور دن کو اس زمانہ میں تین تین حصوں میں بانٹا گیا تھا۔[1] لوگ نصف شب کو جاگ اٹھتے تھے اور دیئے کی دھیمی لو میں اپنا کام کاج شروع کرتے تھے۔ عورتیں چرخا کاتتی تھیں۔ دھان کوٹتی تھیں اور گھر گرہستی کا کام کرتی تھیں۔ دیہاتوں میں گھریلو دستکاریوں کا رواج تھا۔ خوراک میں کوئی نمایاں فرق نہیں تھا۔ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہی چائے کا رواج بڑھ گیا تھا۔ مسلمان نمکین چائے اور پنڈت عام طور سے قہوہ پیتے تھے۔ دیہاتوں میں نمکین چائے کا رواج ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں تھا۔ نسوار اور تمباکو نوشی کا استعمال عام تھا۔

زمانے نے کروٹ بدلی۔ سائنس کی محیر العقل ایجادات نے دنیا کے جغرافیہ کو بدل دیا ہے۔ ریاست سے باہر اور سمندر پار کے ممالک کی سیاحت، کاروبار اور لین دین نے کشمیریوں کے لباس، رہن سہن اور آداب زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں رونما کی ہیں۔ زمانہ حال میں دیسی اور بدیسی دونوں طرح کے لباس اور طرزِ زندگی کا چلن ہے۔ مرد کوٹ، پتلون، ٹائی، شیروانی، کھلا پاجامہ، گاندھی ٹوپی، جناح اور افغان کٹ کی ٹوپی، کھدر کا کرتہ، شلوار اور قمیض، خان ڈریس، بیل باٹم، گون، تہمد غرض ہر طرح کا لباس استعمال کرتے ہیں۔ گھر کی چار دیواری میں سردیوں کے موسم میں اب بھی کانگڑی اور پھیرن محبوب اور مقبول ہیں۔ پگڑیاں اپنے جملہ اقسام کے ساتھ

۱۔ والٹر لارنس: ویلی آف کشمیر ص ۲۵۳

غائب ہوتی جا رہی ہیں۔ عورتوں میں پھیرن کا رواج اب بھی ہے مگر قدرے کم۔ ترنگہ کسابہ اور قرابہ معدوم اور قصہ پارینہ بنتا جا رہا ہے۔ اس کی جگہ ساڑھی، شلوار، قمیض اور میکسی نے لی ہے۔ برقعے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔

مکانات کے ڈیزائن بدل گئے ہیں۔ لوگ اب کالونیوں کی پرسکون اور الگ تھلگ زندگی پسند کرنے لگے ہیں۔ لوگوں میں نفاست پسندی اور مغربیت کے اثرات پیدا ہو گئے ہیں۔ مکانات چھوٹے اور بڑے دونوں طرح کے تعمیر ہونے لگے ہیں تانگے کا رواج کم ہو گیا ہے۔ بسوں کاروں اور سکوٹروں نے ان کی جگہ لی ہے۔ لوگوں کے تفریحی مشاغل بدل گئے ہیں۔ گلی ڈنڈا، کبڈی اور "سپز لونگ" کی جگہ کرکٹ، ہاکی، ٹینس، بیڈمنٹن نے لی ہے۔ ٹیلی ویژن، ریڈیو اور سینما نے مذاق بدل دیئے ہیں۔ چھتوں کے لالہ زار کے بدلے ٹیلی ویژن کے انٹینا کی بہار ہے۔ بجلی کے لیمپ اور ٹیوب لائٹ نے مٹی کے دیئے کی مدھم لو ختم کردی ہے۔ چرخے کی جگہ سلائی کی مشین لے رہی ہے۔ نمکین چائے اور قہوہ کے ذائقہ کی جگہ کافی اور لیپٹن کی چائے کی خوشبو پسند کی جاتی ہے۔ گائے کے تھنوں سے ابلے ہوئے گرم دودھ کے بدلے پوڈر اور کنڈلنسڈ دودھ آنے لگا ہے۔ کاڈارہ اور لتہ پورہ کا ساگ اب ایک خواب ہے۔ گرُس، سدر گانٹز، چھوکہ دہ ذ، واہ ژیخ اور کسنہ بوتب، کا کوئی تصور آج کے کشمیری بچوں کو نہیں ہے اور اس طرح صدیوں پرانی زندگی، لباس، رہن سہن اور آداب زندگی یکسر تبدیل ہو گئے ہیں اور نئے باب کا آغاز ہوا ہے۔ کون جانے آنے والا وقت ہماری طرز زندگی میں کون سی بہار لے آئے۔

آثارِ قدیمہ

ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے دور صدیوں پرانے دھندلکے نظر آتے ہیں ٹوٹے پھوٹے پتھروں اور اینٹوں پر سے منوں مٹی، گھاس اور کائی کی صدیوں پرانی سنگلاخ تہیں کھرچ کھرچ کر ایک نئی دنیا کی بازیافت ہوتی ہے۔ تلاش اور جستجو کی ازلی پیاس نے انسان کو کہاں کہاں پہنچا دیا ہے۔ غاروں اور گپھاؤں کے صنم کدوں، پتھر کی مورتیوں اینٹوں اور ٹائیلوں پر کندہ نقوش، عبادت گاہوں کے خستہ حال در و دیوار باغوں کی ٹوٹی پھوٹی بارہ دریوں کے حقیقی اسرار کو سمجھنے کے لئے انسان نے اپنے ذوقِ جستجو کو رہنما بنایا ہے اور اس نے ان سناٹوں اور تنہائیوں کے پسِ پشت ان پر اسرار لمحوں، ان کے تقدس، ان کی معنی خیز آہٹوں کو پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ جو ان ٹوٹے پھوٹے در و دیوار اور بام و سقف سے لپٹی ہوئی ہیں۔ انسان کی اسی مسلسل کد و کاوش نے اسے قدیم تہذیبوں کی دہلیز پر پہنچا دیا ہے۔ جہاں صدیوں کی دیواریں ڈھ جاتی

ہیں۔ زماں و مکاں کا بعد ٹوٹ جاتا ہے۔ اور انسان کا رشتہ قدیم ترین انسان سے قایم ہوتا ہے۔

کشمیر نے ستی سر جھیل کی نیلاہٹوں سے لے کر آج تک کتنے روپ بدلے ہیں۔ انسانی جغرافیہ اور انسانی تواریخ کی کتنی حقیقی جستہ جستہ ابھری ہیں۔ ان کو سمجھانے میں سب سے بڑا ہاتھ پرانے مسودات اور کھنڈرات کا ہے۔ انسان کی گزشتہ عظمتوں پرانے بادشاہوں کی بصیرت اور ذوق و شوق، معماروں کی کاریگری اور ان گنت بے نام ذہنوں کے خونِ جگر کی نمود پتھروں اور مٹی پر منقش شبیہ کاری اور حسن کاری سے ہوتی ہے۔ آثار قدیمہ کے بصیرت افروز علم نے صدیوں کی تاریکیوں میں چراغ روشن کئے ہیں اور یہ بات واضح کی ہے کہ کشمیر کے قدیم کھنڈرات ہندوستان کی قدیم تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ پنڈت آنند کول بامزی اپنی قابل قدر تصنیف (ARCHAEOLOGICAL REMAINS OF KASHMIR) کے مقدمے میں ڈاکٹر نیوے کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> "قدیم ہندوستان کی ابتدائی تہذیب میں کشمیر کے شاندار کھنڈرات سے زیادہ قابلِ ذکر کھنڈرات نہیں ہیں۔ یہ کھنڈرات کشمیر کے لئے باعث افتخار اور سیاحوں کے لئے قابلِ تحسین ہیں۔ فن تعمیر کے اعتبار سے شاندار اور پرشکوہ عمارتیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں ہوں تو ہوں لیکن متناسب حدوں تک عظیم اور پرشکوہ قدیم عمارتیں کشمیر کے سوا اور کہیں نہیں ملتیں۔"

ماہرین آثار قدیمہ اس بات پر متفق ہیں کہ عیسوی صدی سے ماقبل کسی قابل ذکر عمارت کے نشان نہیں ملتے حتیٰ کہ عیسوی کی ابتدائی چھ صدیوں کے دوران بھی کوئی قابل ذکر عمارت نظر نہیں آتی۔ اس دوران صرف برزہ ہامہ کی گڑھوں والی رہائش گاہیں قابل ذکر ہیں جن کا ذکر آگے ہوگا یا پھر بودھ دھرم سے متعلق وہ عمارتیں ہیں جو ہاروان اور اوشکر میں ملی ہیں اور جن کا تعلق کشان عہد سے ہے۔ پنڈت آر۔ سی۔ کاک اپنی تصنیف میں رقم طراز ہیں:-

"کنشک کے انتقال کے بعد بھی گاندھارا کی سلطنت کے ساتھ برابر تعلقات قائم رہے۔ شمال مغرب کے ساتھ ہندوستان کے ان تعلقات نے وادی کے بودھ اور ہندو فن تعمیر پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس زمانہ کی بودھ عمارتوں میں طرزِ تعمیر وہی ہے جو گاندھارا کی عمارتوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ البتہ خام مواد اور تزئین کاری کے معاملے میں تھوڑا سا فرق ضرور ہے۔" ۱ـه

کشمیر میں جگہ جگہ کھنڈرات ملتے ہیں۔ مندر، مسجدیں، بودھ وہار، اینٹوں اور پتھروں میں منقش حسن کاری، برتن، ہتھیار، آلات اور ظروف اور ایسی ہی ان گنت چیزیں انسانی ذہن کے دریچے کھول دیتی ہیں۔ برزہ ہامہ، ہاروان، مارتنڈ، پرہاس پور، بومہ زو، ہاری پربت، مدین صاحب، جامع مسجد، مسجد اخون ملا شاہ، پری محل، مغل باغات اور ایسی ہی لاتعداد جگہوں کے کھنڈرات کی سچائیوں پر سے پردے سرکاتے ہیں۔ یہ ایک لمبی اور دلچسپ داستان ہے۔ یہاں ہم صرف چند اہم کھنڈرات کا ذکر کرتے ہیں۔

۱ـه R.C. KAK: ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR PAGE 50

بُرزہ ہامہ

سرینگر سے کوئی پندرہ کلو میٹر دور بُرزہ ہامہ نام کا ایک گاؤں ہے حالیہ برسوں کے دوران اس کی کھدائی سے کئی نئی باتوں کا انکشاف ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں "پتھروں کے زمانے" کی تہذیب پروان چڑھی تھی۔ یہاں کے قدیم لوگ گڑھوں میں رہائش کرتے تھے یہ گڑھے کریوہ کی بلندی پر کھودے گئے تھے ان رہائش گاہوں کی بنیاد (نیو) عام طور سے گول یا بیضوی شکل کی ہے اور دہانے تنگ و تاریک۔ ان پر گیلی مٹی کا پلاسٹر چڑھایا جاتا تھا۔ بعض گڑھوں میں زینے بھی ملے ہیں اور بعض میں ایک دوسرے سے ملانے والے زمین دوز راستے بھی۔ آر۔ سی۔ رے کے مطابق ان گڑھوں پر پھوس کی چھتیں تھیں۔ وہ بعض چولہوں اور اناج جمع کرنے والے گڑھوں کی موجودگی سے یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ ان گڑھوں کے مکیں گرمیوں میں گڑھوں سے باہر آ کر رہتے تھے۔ یہاں پر کھدائی کی دوسری منزل سے کئی اور باتوں کا پتہ چلا ہے اور لوگوں کی تہذیبی زندگی کی کئی نئی منزلیں دریافت ہوئی ہیں۔ اب ایسی رہائش گاہوں کے نشان ملتے ہیں جو اینٹوں سے بنے ہوئے ہیں۔ ابتدائی دور کے گڑھے بھر دیئے گئے ہیں۔ مٹی کے برتن اب مقابلتاً بہتر ہیں اور واضح طور پر ایک ارتقائی منزل کا احساس ہوتا ہے۔ تیسری منزل کی کھدائی کچھ بہتر باتوں کا سراغ دیتی ہے۔ خاص طور پر مٹی کے برتن چاک کی مدد سے بنائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ برزہ ہامہ سے متعلق 'پتھروں کے زمانہ کی تہذیب ۱۵۰۰-۲۳۰۰ قبل مسیح کے درمیان پروان چڑھی اس زمانہ کی تیسری منزل کے نقوش دوسری اور تیسری صدی عیسوی تک ملتے ہیں[1] یہاں کھدائی کے دوران کچھ قبروں کے

۱:- DR. S.R. RAY : EARLY HISTORY AND CULTURE OF KASHMIR. P-113

آثار ملے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں مردوں کو دفن کرنے کا رواج تھا۔

ہاروان

مر آرل سٹائین نے ہاروان کو زمانہ قدیم کا شدار ہارڈون (سلادون) کہا ہے۔ جو "چھ ربشیوں کا کنج" تھا۔ اس جگہ کا ذکر راج ترنگنی میں بھی آیا ہے۔ ہاروان میں کچھ کھنڈرات ملے ہیں جو اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہاں کسی زمانے میں مندر موجود تھے۔ لیکن کسی مورتی کا پتہ نہیں چلتا۔ مندر کے کھنڈرات کے ساتھ کچھ ٹائلیں دستیاب ہوئی ہیں جو مختلف صورتوں اور نمونوں کی ہیں ان پر فن کاری کے بعض عمدہ نمونے منقش نظر آتے ہیں۔ ان میں کچھ پھول، پتے جھیل ڈل میں پائے جانے والے آبی پودے، کنول، ادرتو اور بطوں، ہرنوں اور مرغوں کی تصویریں، رقص کرنے والی عورتوں کی شبہیں، گلدان تھامے ہوئے دوشیزائیں بڑی خوبصورتی اور نفاست سے کندہ کی ہوئی ملتی ہیں۔ ان ٹائیلوں پر کھروشٹی رسم خط میں بعض اعداد بھی نظر آتے ہیں۔ ہر ٹائیل اپنے عدد کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے۔ آر، سی، کاک کے مطابق کھروشٹی اعداد کی موجودگی سے ان ٹائیلوں کی تاریخ آسانی سے متعین ہو سکتی ہے۔ کھروشٹی رسم خط کا چلن شمال مغربی ہندوستان میں پانچویں صدی عیسوی کے بعد نہیں تھا اس لئے ٹائیلوں اور کنکروں والی معماری کی تاریخ تیسری صدی عیسوی ہو سکتی ہے[1] جن ٹائیلوں کا ذکر اوپر ہوا ان کے بارے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ ان پر جو شبیہیں بنی ہوئی ہیں وہ آج کل کے انسانوں جیسی نہیں بلکہ لباس اور وضع قطع سے یہ لوگ کاشغر اور یارقند کے لوگوں سے ملتے جلتے ہیں یہ اس بات کا بین

1- R.C.KAK: ANCIENT MONUMENTS OF KASHMIR P. 115

ثبوت ہے کہ یہ اس زمانہ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جب کشان بادشاہوں کے ہاتھوں میں یہاں کی عنان سلطنت تھی اور یہ دور یقینی طور پر بُدھ دور رہے۔ ہارون کی عمارتیں کنشک کے نام سے منسوب کی جاتی ہیں جس کا تعلق پہلی صدی عیسوی سے ہے۔ کنشک نے اسی زمانہ میں کشمیر میں ایک بودھ کونسل کا اہتمام کیا تھا اور گمان غالب ہے کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں یہ مجلس منعقد ہوئی تھی بودھ عالم ناگ ارجن کا مستقر بھی یہی مقام بتایا جاتا ہے۔ ہارون کی ٹائیلوں کی ایک خاص خصوصیت یہ بتائی جاتی ہے کہ اس قسم کی ٹائیلیں دنیا میں اور کہیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ شروع شروع میں صرف کنکروں سے عمارتیں تعمیر ہوتی تھیں ان کے کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تیسری صدی عیسوی میں تعمیر ہوئی تھیں۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے درمیان تعمیر ہوئی عمارتوں کے کھنڈرات سے معلوم ہوتا ہے کہ کاریگر عمارتوں کو مضبوط بنانے کے لئے کنکروں کے درمیان پتھر بھی ڈال دیتے تھے۔

مارتنڈ

کشمیر کے قدیم مندروں کے کھنڈرات میں مارتنڈ جلال و جمال کی خوبصورت مثال ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا خوب صورت محل وقوع ہے۔ چونے کے پتھروں سے بنا ہوا یہ مندر موجودہ مٹن (اننت ناگ) کے نزدیک ایک کریوہ پر تعمیر کیا گیا تھا۔ مندر کی تعمیر میں کتنے بڑے اور سنگا خ پتھر استعمال ہوئے ہیں۔ یہ بات بذات خود باعث حیرت ہے کہ زمانہ قدیم میں کشمیر کے لوگ جبر ثقیل کے علم کی ان عظمتوں سے واقف تھے جس سے بڑے سے بڑے پتھر کافی بلندیوں پر پہنچائے جاتے تھے۔ کلہن نے راج ترنگنی میں اس بات کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ اس مندر کے کھنڈر بقول ینگ ہسبنڈ مغربی اور یونانی مندروں کی شان رکھتے ہیں کننگھم ان پر یونانی آرٹ کے گہرے اثرات کا ذکر کرتا ہے۔

آر، سی، کاک ان مندروں پر بودھ فن تعمیر کا ذکر کرتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ کشمیر کے تمام مندروں سے یہ مندر سب سے زیادہ تکمیل کو پہنچا ہوا مندر ہے۔ آنند کول بامزئی کے مطابق مرکزی عمارت ۶۳ فٹ لمبی ۳۶ فٹ چوڑی ہے۔ سامنے کی طرف ایک پوجا کی جگہ ہے جو ستونوں کی اس قطار سے بلند ہے جس پر مندر تعمیر ہے۔ فن تعمیر کے اس عظیم الشان نمونے کی تاریخ تعمیر کے بارے میں حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ گمان غالب ہے کہ اس کی بنیاد ۳۷۰۔۔۵۰۰ء کے دوران ڈالی گئی۔ راج ترنگنی کے مطابق ستونوں کی قطار مہاراجہ للتہ دیتہ نے (۷۰۱۔۔۷۵۷ء) بنوائی تھی اور اس کی ابتدائی تعمیر راجہ رانا دیتہ (۲۲۲ء) کے زمانہ میں ہوئی اور اس کی دوسری ملحقہ عمارتیں اس کی رانی امرت پربھا نے تعمیر کروائی تھیں۔ بعض عالموں کا خیال ہے کہ یہ سوریہ مندر ہے لیکن فرگوسن اس خیال کی تردید کرتے ہوئے اس کی تعمیر اونتی پورہ کے مندر کے سو سال بعد قرار دیتا ہے۔ کننگھم کے مطابق یہ اصل میں سوریہ مندر ہی ہے۔ وہ اس کی وجہ تعمیر یہ بتاتا ہے کہ اس کا محل وقوع دھوپ کی فضا کے لئے مناسب تھا۔ مندر کے اندر جانے کے لئے اب تک تین دروازے موجود ہیں۔ ماہرین کا خیال ہے کہ مندر کے اندر جانے کے لئے سیڑھیاں بنی تھیں۔ اندر یتر مورتی کا اوپر والا نصف مجسمہ موجود تھا۔

شنکر آچاریہ کا مندر

شنکر آچاریہ کا مندر کشمیر کا بہت اہم اور قابل دید مندر ہے۔ جھیل ڈل کے کنارے سرینگر شہر کے جنوب مشرق میں شنکر آچاریہ پہاڑی پر ایک خوبصورت مندر ہے۔ یہ سطح سمندر سے ۲۰۱۱ میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔ راج ترنگنی میں اس پہاڑی کو گوپادری کہا گیا ہے۔ ابوالفضل اسے کوہ سلیمان کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس مندر کی تاریخ تعمیر خاصی متنازعہ فیہ ہے۔ جنرل کننگھم اور لفٹیننٹ کول

کے مطابق اس مندر کو مہاراجہ اشوک کے بیٹے جلوکا نے ۲۲۰ ق م کے دوران تعمیر کروایا تھا۔ کلہن اسے راجا گوپادتیہ (۳۶۸ - ۳۰۸ ق م) کی تعمیر قرار دیتا ہے لیکن ماہرین آثار قدیمہ ان باتوں سے متفق نظر نہیں آتے۔ ایک اور انگریز مورخ فرگوسن اس کی تعمیر کسی نامعلوم ہندو کے نام سے منسوب کرتا ہے جس نے اسے شو کی پوجا کے لئے مغل شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بنوایا تھا اور جس کی مزید تعمیر اورنگ زیب کے پہلے سال جلوس میں روک لی گئی تھی۔ لیکن کئی دوسرے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ مندر قرون وسطی کے دوران تعمیر ہوا تھا۔ جب اس طرح کی دوسری عمارتیں مثلاً پٹن کے مندر تعمیر ہوئے تھے۔ گمان غالب ہے کہ جیشٹھ رودر کا مندر بھی اسی جگہ واقع تھا۔ مندر کے سامنے اسلامی فن تعمیر کے دو ایک کھنڈر بھی ملتے ہیں جو شاہجہان کے عہد کے بتائے جاتے ہیں۔ ساون کی پورنماشی کو ہر سال یہاں میلہ لگتا ہے اور ہزاروں عقیدت منداس مندر میں درشنوں کے لئے چلے آتے ہیں۔

پاندریٹھن

پاندریٹھن کی تاریخ قدیم ہے۔ یہ پران ادھشٹان کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جس کے معنی پرانے شہر کے ہیں۔ پران ادھشٹان سری نگری کے نام سے مہاراجہ اشوک نے تیسری صدی عیسوی میں بسایا تھا۔ لیکن کوئی آٹھ سو سال بعد پرورسین دویم نے اپنی راجدہانی دریائے جہلم کے کنارے موجودہ سرینگر کے قریب آباد کی۔ اور اسے سری نگر کا نام دیا۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ مہاراجہ اشوک کی سری نگری کا نام بھی اب کوئی نہیں جانتا۔ بہر حال یہی پرانا شہر پران ادھشٹان یا پاندریٹھن ہے۔ یہاں عہد قدیم کا مندر ہے جو ایک ۴۰ فٹ مربع تالاب پر تعمیر کیا گیا ہے۔ بعض تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ مندر قدیم ہے اور راجہ ابھیمنو کے عہد حکومت کے دوران جب سارا شہر جل کر خاکستر ہو گیا تو صرف یہی ایک مندر اس کی دست برد سے بچ گیا[1] لیکن

[1] موتی لال ساقی: بیانی بتہ کالکی کھنڈرات (سون ادب ۱۹۷۷ء ص ۲۸)

جنرل کننگھم اور لیفٹیننٹ کول اس بات پر متفق ہیں کہ یہ مندر وشنو مرار دھان سوامی کا مندر ہے اور اسے میرو وردھن نے تعمیر کروایا تھا۔ حتمی طور پر یہ بتانا مشکل ہے کہ آیا یہ ہندو مندر ہے یا بودھ مندر لیکن اس کے نام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ مندر ہندو عقیدے سے تعلق رکھتا ہے۔

اونتی پورہ

سری نگر جموں قومی شاہراہ پر سری نگر سے کوئی ۳۰ کلومیٹر دور راجہ اونتی ورمن (۸۵۵-۸۸۳ء) کا بسایا ہوا شہر اونتی پورہ ہے۔ جو اس کی راجدھانی بھی تھا۔ اب اس جگہ کی اہمیت صرف ان کھنڈرات کے باعث ہے جو دو مندروں کی صورت میں شدائدِ زمانہ کا مقابلہ کرتے ہوئے اب تک موجود ہیں۔ ایک مندر شو سوامن مندر ہے اور دوسرا اونتی سوامن وشنو مندر ہے۔ ان مندروں کے کھڑے اور گرے ہوئے دیوہیکل پتھر مندروں کے جلال کے ضامن ہیں۔ کشمیر آنے والا کوئی بھی سیاح ان مندروں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ پتھروں پر منقش شبیہ کاری جلال کے ساتھ ساتھ ان کے جمال کی آئینہ دار ہیں۔ دونوں مندروں کے درمیان تقریباً آدھ میل کا فاصلہ ہے۔

پریہاس پورہ

پریہاس پورہ یا پراس پور موجودہ شادی پورہ سے کوئی چار کلومیٹر دور جنوب مغرب میں واقع ہے۔ یہ شہر مہاراجہ للتہ دیتہ مکتاپیڈ نے اپنی راجدھانی کے طور پر آباد کیا تھا۔ اس شہر کے کھنڈرات میلوں تک پھیلے ہوئے ملتے ہیں۔ للتہ دیتہ نے کافی عمارتیں، مندر اور وہار تعمیر کروائے تھے۔ ان میں خاص طور پر وہ پانچ مندر مشہور تھے جن کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ مکتا کیشو مندر میں وشنو کی سونے کی مورتی تھی۔ پریہاس کیشو میں چاندی کی مورتی اور مہاویر کے مندر میں سونے کے ہتھیاروں سے مزین مورتی تھی۔ اس کے علاوہ گووردھن دھاری وہار میں چاندی کی مورتی تھی۔ راج وہار

بودھوں کا دہار تھا جس میں مہاتما بدھ کا بڑا مجسمہ تھا۔ پرہاس پور میں دریائے سندھ اور وتستا کا سنگم ہونے کے باعث بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ مہاراجہ اونتی ورمن کے عہد میں دریائے جہلم کا رُخ موڑے جانے کے باعث یہ سنگم موجودہ شادی پورہ میں بن گیا اور پرہاس پور کی شان اور اس کی اہمیت ختم ہو گئی۔ بعد میں یہ شہر سکندر بت شکن کے ہاتھوں تاراج ہوا۔

اندر کوٹ

موجودہ شادی پور سے کوئی سات آٹھ کلومیٹر دور راجا جے پیڈ نے (۷۵۳-۷۸۴ء) اپنی راجدھانی جے پیڈ پور میں بنوائی تھی جسے آج اندر کوٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں چند پرانے مندروں کے کھنڈرات ملتے ہیں۔

بیجبہاڑا

بیجبہاڑا ہندوؤں کا قدیم تیرتھ وجیشور ہے۔ جسے راجا وجیا نے تعمیر کروایا تھا۔ یہاں کسی زمانے میں شو وجیشور کا مقدس استھاپن تھا۔ کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ اشوک نے یہاں ایک بدھ وہار تعمیر کروایا تھا۔ یہاں بہت سے کھنڈرات بکھرے ہوئے ہیں۔

پٹن کے کھنڈرات

پٹن میں سڑک کے کنارے دو قدیم مندر ملتے ہیں۔ یہ مندر فن تعمیر کے اعتبار سے مارتنڈ کے مندروں سے ملتے جلتے ہیں۔ ایک مندر اونتی ورمن کے بیٹے راجہ شنکر ورمن (۸۸۳-۸۹۰ء) اور دوسرا اس کی رانی سوگندھا نے تعمیر کروایا تھا۔ ان مندروں کے کھنڈرات میں کاریگری کے اعلیٰ نمونے دستیاب ہوئے ہیں۔ پٹن کے قریب ہی ایک کریوہ کے دامن میں تاپر میں ایک اور مندر کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ شنکر ورمن نے للتہ دیتہ کے بسائے ہوئے شہر پرہاس پور کے مندروں سے قیمتی ساز و سامان اٹھا کر شنکر پورہ (پٹن) کو آباد کیا تھا۔ تاپر کا مندر پرتاپ پیڈا دوئم کی رانی نریندر پربھا کے نام سے منسوب

ہے۔ پرتاپ پیڈ کا عہدِ حکومت ۶۳۴-۴۶۸ ہے۔

بونیار

بارہمولہ سے کوئی ۱۸ کلومیٹر دور بونیار واقع ہے۔ یہاں کا مندر تباہی سے بچ گیا ہے۔ یہ مندر سنگ سمنت سے بنا ہوا ہے۔ جس کی کان دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر اب بھی موجود ہے۔ مندر کی تاریخ تعمیر کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا۔ کننگھم کا خیال ہے کہ بونیار کا نام بھوانی پور رہا ہوگا۔ اور بھوانی ماں کے نام سے منسوب رہا ہوگا۔

ناراں ناگ

ناراں ناگ وانگت کے قریب واقع ہے۔ یہ کشمیر میں ہندوؤں کا مشہور تیرتھ استھان ہے یہاں ایک بڑے چشمے کے آس پاس کئی مندروں کے کھنڈرات ہیں جن کی تعمیر قرون وسطیٰ کی بتائی جاتی ہے۔ اصل میں یہاں مندروں کے دو حلقے ہیں۔ وانگت کے نزدیک پہلے حلقے میں چھ مندروں کے کھنڈرات ہیں جن کے ارد گرد ایک دیوار ہے۔ ناراں ناگ کا قدیم نام سدار تیرتھ ہے۔

زینہ لنک

جھیل ولر کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہے۔ اس کا قدیم نام "مہا پدم سرس" بتایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا جس پر ایک مندر تعمیر کیا تھا۔ امتداد زمانہ نے اس مندر کو منہدم کیا۔ بڈشاہ نے اس جزیرے کو وسعت دیکر ایک مسجد اور ایک جھونپڑی بنوائی تھی۔ اب صرف کھنڈر ہی کھنڈر ہیں۔ آر۔ سی۔ کاک کا خیال ہے کہ مندر جس کے کھنڈرات اب بھی ملتے ہیں، غالباً بڈشاہ نے ہی تعمیر کروایا تھا۔

اوشکر

اوشکر کی کھدائی نے کئی نئی باتیں سامنے لائی ہیں۔ یہاں سے سنگ تراشی کے جو

نمونے دستیاب ہوئے ہیں وہ اپنی طرز کے اولین نمونے بتائے جاتے ہیں۔ یہاں کی مورتی گری پر گندھارا کی فن سنگتراشی کے اثرات ملتے ہیں۔ یہاں ایک ستوپا پایا گیا ہے جس کے ارد گرد ایک دیوار ہے۔ اوشکر بارہ مولہ کے قریب ہے۔ ہیون سانگ۔ یہاں سے ہو کر ہی وادی میں داخل ہوا تھا۔ اس دور میں کشمیر میں کئی ستوپ اور بودھ وہار موجود تھے۔ خودادشکہ کے مقام ایک بڑا بودھ وہار تھا جہاں بہت سے بودھ بھکشو قیام پذیر تھے۔ بودھوں کے وہار اور عبادت گاہیں پاندریٹھن، پریہاس پور، کانس پور، ہاردن، سرینگر اور دوسرے مقامات پر موجود تھے۔ شدائد زمانہ نے ان کو مٹا کر رکھ دیا ہے اور ان کے ہلکے نقوش کہیں کہیں نظر آتے ہیں۔

اسلامی فنِ تعمیر

کشمیر میں اسلامی عہد کا آغاز چودھویں صدی عیسوی میں ہوا۔ سب سے پہلا مسلمان بادشاہ رینچن شاہ (۱۳۲۰-۱۳۲۳ء) تھا۔ جس نے اسلام قبول کر کے اسلامی حکومت کا پہلا پتھر رکھا۔ لیکن صحیح معنوں میں سلطان شمس الدین شاہ میر (۱۳۳۹-۱۳۴۲ء) کے عہد سے اسلامی حکومت کا آغاز ہوتا ہے۔ رینچن شاہ (سلطان صدرالدین) نے حضرت شرف الدین بلبل شاہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تھا۔ چناں چہ ان کے نام پر سرینگر کی پہلی مسجد بلبل لنکر (نواکدل) میں تعمیر ہوئی۔ پرانی خانقاہ آگ کی ایک واردات میں جل گئی اس کی جگہ نئی خانقاہ تعمیر ہوئی۔ رینچن شاہ نے اپنے نام سے ایک اور مسجد موجودہ عالی کدل میں تعمیر کرائی جو آج تک خستہ حال صورت میں موجود ہے خود رینچن شاہ کا مقبرہ بلبل لنکر کی ایک گلی میں موجود ہے اور زمانہ کے بے رحم ہاتھوں پر خندہ زن ہے۔

اسلامی دور میں شروع شروع میں ہندو اور بودھ مت کے منہدم مندروں کے مسالے سے عمارتیں بنوائی گئیں۔ چناں چہ ایسی کئی مثالیں مدین صاحب کی مسجد یا

اس کے گرد و نواح کے کھنڈرات یا زین العابدین کی مسجد یا پھر جھیل ولر پر تعمیر کی ہوئی مسجد میں ملتی ہیں۔ بڈشاہ کی والدہ کا مقبرہ اصل میں کوئی ہندو یا بودھ عبادت گاہ بتائی جاتی ہے۔ اسی طرح شاہ ہمدان کی خانقاہ ایک قدیم عمارت ہے اور حضرت میر سید علی ہمدانی رح کے نام پر تعمیر ہوئی ہے۔ بڈشاہ کی والدہ کے مقبرے کا ذکر کرتے ہوئے فرگوسن نے کہا ہے کہ اس کی دیوار اسلامی عہد کی ہے لیکن اس کا مسالہ ہندو تعمیرات سے لیا گیا ہے اور ان پر ہندو تبرکات کی شبیہ کاری اس کا واضح ثبوت ہے۔

جامع مسجد

کشمیر کی اس عظیم الشان مسجد کی تعمیر کو سکندر بت شکن (۱۳۹۰-۱۴۱۵ء) سے منسوب کیا جاتا ہے۔ تواریخی شواہد سے معلوم ہے کہ سکندر کے بیٹے زین العابدین نے اس کے حسن میں اضافہ کیا۔ ۱۴۷۹ء کی آتش زدگی کی واردات میں یہ مسجد خاکستر ہوئی۔ اس کے بعد یہ مسجد کئی بار جلی اور از سر نو تعمیر ہوئی۔ اس مسجد کے مشرقی دروازے سے ایک نہر داخل ہو کر صحن کے بڑے تالاب کو سیراب کرتی تھی جسے زین گنگا کہتے تھے اور جسے بڈشاہ نے تعمیر کروایا تھا۔ اب یہ نہر معدوم ہو چکی ہے۔ سکھ دور میں ۲۱ سال تک یہ عظیم مسجد بند رہی۔ ۲۱ سال کے بعد سکھ گورنر غلام محی الدین نے اسے کھولا تھا۔ جامع مسجد آج بھی زمانے کے سرد و گرم سہتی ہوئی سرینگر شہر کے بیچ پر وقار انداز میں سر اٹھائے کھڑی ہے۔

اخون ملا شاہ کی مسجد

سلطان العارفین حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح کی زیارت عالیہ سے ذرا ہٹ کر ایک عظیم الشان مسجد کے کھنڈرات ملتے ہیں۔ یہ مسجد شاہ جہاں کے بیٹے شہزادہ داراشکوہ نے جو ولی عہد تھا، اپنے استاد اخون ملا شاہ کے لئے بنوائی تھی۔ اس مسجد کی محراب نما نشست گاہیں اس کے در و دیوار مغل فن تعمیر کی عظمت آشکار کرتی ہیں۔ آج یہ عالی شان

مسجد ایک کھنڈر کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

ہاری پربت کی فصیل

اکبر اعظم جب تیسری بار کشمیر آیا تو اس نے ہاری پربت پہاڑی کے ارد گرد ایک فصیل تعمیر کروائی۔ اس کے ساتھ ایک قلعہ تھا جو قلعہ سنگین دروازہ یا قلعہ نگر کہلاتا تھا یہ فصیل بڑی مضبوط ہے اور تقریباً ۵۰ فٹ اوسطاً چوڑی ہے اس فصیل کے اندر ایک شہر آباد تھا۔ جہاں اُمرا اور رؤساء کے باغات اور محلات تعمیر ہوئے تھے۔ شہر میں داخلے کے لئے اصل دروازہ کاٹھی دروازہ تھا۔ لارنس کے مطابق یہ قلعہ چکوں کے مظالم سے بھاگے ہوئے کشمیریوں کو وطن واپس کھینچنے کا وسیلہ تھا۔ مردوں اور عورتوں کو اس قلعے کی تعمیر کے کام کے لئے خاص رقم بطور اُجرت دی جاتی تھی۔ پہاڑی پر جو قلعہ تعمیر ہوا ہے وہ افغان صوبیدار عطا محمد خان نے بنوایا تھا۔ یہ فصیل اور یہ قلعہ اب جگہ جگہ منہدم ہو چکا ہے۔

باغات

کشمیر خود ایک بڑا باغ ہے لیکن اچھے اور خوب صورت باغات سے اطراف کو سنوارنے کی روایت ہمارے یہاں زمانہ قدیم سے ملتی ہے اگرچہ بڈشاہ نے بھی اس طرف توجہ دی تھی لیکن اصل میں مغلوں نے باغوں کے حُسن کو ساری وادی میں بکھیر دیا۔ لارنس کا خیال ہے کہ مغل دور میں جھیل ڈل کے گرد و نواح میں ۷۷۷ باغات تھے لیے نشاط، شالیمار، چشمہ شاہی، چار چنار، ویری ناگ، اچھہ بل کے باغات اب بھی اسی شان و دلربائی سے جلوہ فگن ہیں۔ لیکن چودھری باغ، الٰہی باغ، عیش باغ، باغ ملہ شاہ، باغ بہار آرا، باغ دلاور خان، کوٹھی باغ، رام باغ، دیوان باغ، باغ سوکھ رام باغ علی مردان، باغ جیلال آراد دلر امل اور ایسے ہزاروں باغ اب معدوم ہو چکے ہیں اور ان کے نام اب تاریخ کے پارینہ اوراق میں موجود ہیں۔ زمانے کے سفاک ہاتھوں نے

---

(1) LAWRENCE: THE VALLEY OF KASHMIR PAGE 125.

ان باغوں کی خوشبو مٹا دی ہے۔

پری محل

چشمہ شاہی کے پاس ہی زبرون پہاڑی کی بلندی پر اس باغ کے آثار اب بھی ملتے ہیں اور اب اس کی مرمت ہوتی رہتی ہے۔ جب سے اس کے نقوش محفوظ ہو گئے ہیں قیاس غالب ہے کہ یہاں بھی فوارے موجود تھے۔ جن میں زیر دوز نہروں سے پانی آتا تھا۔ پورا باغ چھ طبقوں میں منقسم تھا۔ اوپر والے طبقے میں اب تک وہ کھنڈرات ملتے ہیں۔ پہاڑی طرف سے پانی آتا تھا۔ یہ دارا شکوہ کی رصد گاہ تھی جہاں ستاروں کی گردش کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔ یہاں ایک لائبریری بھی ہوا کرتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسے دارا شکوہ نے اپنے استاد ملا اخون شاہ کے لئے بنوایا تھا۔

یہ اور اسی طرح کے مقامات، مندر اور وہار، مسجدیں اور خانقاہیں کشمیر کے چپے چپے میں کھنڈروں کے دھندلے نقوش کی صورت میں ملتے ہیں جن کا احاطہ کرنا اس مختصر سے مضمون میں ناممکن ہے۔ لیکن جن کے یہ دھندلے دھندلے نقوش زبان حال سے اپنی گزشتہ عظمتوں کے گواہ ہیں اور ان کو فراموش کرنا اپنی تہذیب کو، اپنے وجود کو فراموش کرنے کے مترادف ہوگا۔ آنے والی نسلیں ان کو یاد کر کے دل مسوس کر اٹھیں گی کون جانے؟

شہرِ لالہ و گل

کشمیر کی جنت کا جب بھی خیال کیجئے تو سری نگر کی من موہنی تصویر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتی ہے۔ سری نگر کا یہ صدیوں پرانا شہر آج بھی اپنی رنگا رنگ تہذیبی روایات کے کھنڈر گود میں سمیٹے اسی تب وتاب اور شانِ دل نوازی کیساتھ کھڑا نظر آتا ہے جیسا بیتی ہوئی صدیوں کے ان مختلف زمانوں میں تھا جب مختلف عقاید کے لوگوں نے اسے اپنے طور سنگار کیا تھا۔ اس شہر کے سینے میں کتنے خواب دفن ہیں اور اسکی آنکھوں میں یادوں کے کتنے گھاؤ رس رہے ہیں کون جانے؟

ہندو مہاراجوں کے وقت میں گونجتی ہوئی شنکھ کی سریلی آوازیں بودھ کلچر کا "بدھم گچھنم سرنامے" اسلام کی توحیدی صدائیں، افغانوں اور مغلوں کی جمالیاتی حس، سکھوں اور ڈوگروں کی دلاوری۔ یہ سب اب بھی یہاں

کے پتھروں دروں اور دیواروں، باغوں اور پیڑوں کی جھومتی ہوئی ڈالوں اور کومل دھرتی کے پیوٹوں میں مسکرا رہا ہے۔ وقت کے بے رحم ہاتھوں نے اگرچہ ان نقوش کو پھیکا کر دیا۔ ہے لیکن یہ نقش لازوال ہیں اور اب بھی وقت کے بیکراں وجود کو چیرتے ہوئے صدیوں پرانی یادیں زندہ کرتے ہیں۔

شری نگر جو اب سری نگر کہلاتا ہے ان چند شہروں میں سے ایک ہے جن کو صدیوں سے راج دھانیاں بنے رہنے کا فخر حاصل ہے اور جو وقت کے شدائد کا مقابلہ کرنے کے باوجود زندہ ہیں تاریخ بتاتی ہے کہ لگ بھگ دو ہزار برس قبل مہاراجہ اشوک نے اس شہر کی بنیاد ڈالی تھی اور اس شہر کا نام "دیوی مہالکشمی" (دھن اور دولت کی دیوی) کے مقدس نام پر شری نگری رکھا گیا تھا۔ شری کے معنی ہیں لکشمی کے جو خوش حالی کی دیوی ہے اور نگری کے معنی شہر کے ہیں۔ اس رعایت سے یہ شہر خوش بختی کا شہر کہلایا۔ اس زمانے میں یہ شہر موجودہ شہر کے آس پاس شنکراچاریہ کی پہاڑی کے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر جنوب کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ جسے کلہن "پران ادھشٹان" کہتا ہے۔ اور آج کل پاندریٹھن کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ شری نگر کا یہ نام بعد میں بادشاہ پرواسین دوئم کی راجدھانی پرواپور کے لئے مخصوص ہو گیا۔ پرواسین کا بنایا ہوا شہر تو اب تک قائم ہے۔ لیکن وقت کی ستم ظریفی نے اس شہر سے اس کا اصلی نام یعنی پرواپورہ چھین لیا اور اس کے بجائے اشوک اعظم کے شہرت یافتہ شہر کا نام چسپاں کر دیا۔ چنانچہ پرواپورہ کے بعد یہ شہر شری نگری ہی کہلایا البتہ مسلمان حکمرانوں نے اپنی حکومت کے دوران سری نگر کے نام کو بدل کر اسے پورے ملک کا نام دیا اور عرصۂ دراز تک سری نگر کو "کشمیر" کہا جاتا رہا۔ کشمیر اور لداخ کے

گزیٹیر میں جو ہندوستان کے کوارٹر ماسٹر جنرل (انٹیلی جنس برانچ) کی نگرانی میں تیار کیا گیا تھا اس بات کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے :-

"ہم دیکھتے ہیں کہ اورنگ زیب کے زمانے میں برنیر اور فورسٹر جو اس ملک کا دورہ ۱۷۸۳ میں کرتے رہے سرینگر کے بجائے "کشمیر" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ سکھوں نے اپنی فتح کے بعد پرانا ہندو نام پھر سے استعمال کیا۔ [۱]

کشمیر کے بارے میں چینی سیاح ہیون تسانگ کی تفصیل غالباً اولین تواریخی دستاویز ہے وہ ۶۳۱ء کے دوران کشمیر آیا تھا اور یہاں دو سال قیام کیا تھا۔ اس کے بیان کے مطابق اس زمانے میں کشمیر کی راجدھانی ایک دریا کے کنارے آباد تھی۔ کلہن کے مترجم اور مشہور سنسکرت عالم سر ارل سٹین نے ہیون سانگ کی اس تفصیل کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

"وہ اسے (راجدھانی کو) ایک بڑے دریا یعنی ولستا کے کنارے آباد بتاتا ہے جو شمال سے جنوب کی جانب ۱۲ یا ۱۳ لی لمبا اور مشرق سے مغرب کی طرف ۴ یا ۵ لی چوڑا ہے۔ لی ایک چینی ناپ ہے۔ ڈھائی میل کا یہ فاصلہ جو چینی ناپ کے ۱۲ یا ۱۳ لی سے ظاہر

---

[۱] GAZETTER OF KASHMIR & LADAKH " COMPILLED UNDER THE DIRECTION OF THE QURRTTER MASTER GENERAL IN INDIA IN THE INTELLIGENCE BRANCH (1890) P. 770

کیا گیا ہے۔ وتستا کے دائیں کنارے کے ساتھ
شہر کی پرانی حدود کے ساتھ عین مطابقت
رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کی چوڑائی جو ایک
میل سے کم ہے (۴ یا ۵ میل) بھی بالکل
صحیح ہے۔" ؎۱

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہیون سانگ کے زمانے میں یہ شہر جو اس زمانے میں سرینگر نہیں کہلاتا تھا۔ وتستا کے کنارے آباد تھا۔ ارل سٹین کے مطابق جنرل کینگھم ؎۲ نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ہیون سانگ کے زمانے میں کشمیر کی راجدھانی درحقیقت موجودہ سرینگر تھا۔ ارل سٹاین رقم طراز ہیں:

"جنرل کینگھم نے اخذ کیا ہے کہ پرانی راجدھانی
جو "پران ادھشٹان" کی جگہ پر واقع تھی حقیقت
میں قدیم شہری نگری تھی جو کلہن نے اشوک اعظم
کی بنائی ہوئی راجدھانی کہا ہے" ؎۳

ارل سٹاین نے ہیون سانگ کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے وقت کا دارالخلافہ ہی دراصل موجودہ سرینگر ہے لکھتے ہیں:

"اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہیون سانگ
کے وقت کی راجدھانی جو آج کے سرینگر

؎۱ راج ترنگنی (جلد دوئم) مترجمہ ارل سٹاین صہ ۴۳۹

؎۲ الیگزنڈر کینگھم ۱۸۴۶ء میں کشمیر میں ڈوگرہ شاہی کے قایم ہونے کے بعد وادی میں سیاسی مشن پر بھیج دیئے گئے تھے۔

؎۳ راج ترنگنی (جلد دوئم) ترجمہ اسٹن صہ ۴۴۴

سے مطابقت رکھتی ہے مقابلتاً نئی بنیاد
تھی .... اس طرح پرانے شہر کا جو حوالہ
ملتا ہے اس سے ہم اس کی پہلی راجدھانی
کی حدود مقرر کر سکتے ہیں جو اشوک کی سرینگری
آج کا پاندریٹھن یا کلہن کا "پران ادھشٹان"
ہو سکتا ہے۔" [۱]

بامزئی نے اپنی تاریخ کشمیر میں ہیون سانگ کے تذکرے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے ہاں راجدھانی کے جس شہر کا ذکر کیا گیا ہے وہ پرواپور ہی ہے لکھتے ہیں :-

" اس کے علاوہ راجدھانی شہر کے بارے
میں بھی واضح بیان ملتا ہے اس کو پو۔لو۔آن
لو۔پو۔لو۔ PO. LO. ON - LO - PO - LO
کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جو پرواپور
کا صحیح REPRODUCTION ہے۔ یہ وہ نام
ہے جس سے اس زمانے میں سرینگر کو
موسوم کیا جاتا تھا۔" [۲]

کلہن اور تواریخ کشمیر کے دوسرے مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ سرینگر کا اصلی نام پرواپور یا پرواس نگر تھا اور اس کی بنیاد کشمیر کے مشہور بادشاہ پرواسین

---

[۱] راج ترنگنی (جلد دویم) ترجمہ اسٹین صفحہ ۴۴۹
[۲] پی۔ این۔ کے بامزئی۔ ہسٹری آف کشمیر صفحہ ۴۳

دویم نے چھٹی صدی کے دوسرے نصف میں ڈالی جیسا کہ اوپر کہا گیا یہ شہر ہیون سانگ کے کشمیر آنے سے پہلے آباد ہو چکا تھا۔ ہیون سانگ بھی اشوک اعظم کے پران ادھشٹان کے مقابلے میں اس شہر کو "نیا شہر" ۲ کہتا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ شہر ہیون سانگ کے زمانے میں نیا نیا آباد ہو چکا تھا۔ کلہن کی راج ترنگنی میں اس نئے شہر کے آباد ہونے کا ذکر بڑا دلچسپ ہے۔ ارل سٹائن کے مطابق کلہن کی کہانی (اس شہر کے بارے میں) راج ترنگنی کے ۳۳۶-۳۴۹ (تیسرا حصہ) اشلوکوں میں ملتی ہے۔ اس بات کے باوجود کہ ساری کہانی روایت کے طلسم میں لپٹی ہے اس میں شہر سے متعلق جو بیان ملتا ہے وہ بڑا دلچسپ اور واضح ہے۔ کلہن نے راج ترنگنی میں جو کہانی لکھی ہے وہ کچھ یوں ہے۔ جب راجہ پرواسین دویم اپنی فتوحات کے بعد واپس لوٹا تو اس کی بڑی خواہش ہوئی کہ وہ یادگار کے طور پر ایک شہر آباد کرے کافی عرصے تک وہ شہر کے لیے مناسب جگہ کا انتخاب نہ کر سکا۔ تب اس نے کسی فوق الفطری طریقے سے جگہ تلاش کرنے کی ٹھان لی۔ گپ اندھیری رات تھی۔ راجہ اپنے محل سے اکیلا ہی چل پڑا۔ کافی مسافت کے بعد اسے ایک جگہ نظر آئی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ دریا کے کنارے شمشان گھاٹ ہے جہاں چتائیں جل رہی ہیں۔ رات کے بھیانک اندھیرے میں دور دور تک شمشان گھاٹ کی آگ سے ہیبت ناک سائے نظر آتے تھے۔ راجا نے جب چاروں طرف دیکھا

---

۱ پرواسین دویم وکرمادتیہ کی وفات اور ماترگپت کی تخت سے دستبرداری کے بعد کشمیر کا حکمران ہوا۔ وہ ایک بہادر بادشاہ اور پاک نفس آدمی تھا۔ اس نے ساٹھ سال حکومت کی۔ اپنے بزرگوں کی کھوئی ہوئی سبقت حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے نام پر ایک نیا شہر آباد کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس خواہش کی تکمیل میں اسے بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر اس کی تمنا بر آئی۔

۲ پی این کے بامزئی۔ ہسٹری آف کشمیر صفحہ ۸۳

تو دریا کے دوسرے کنارے کے قریب ایک بے حد ڈراونی صورت نظر آئی۔ یہ قد و قامت
کے لحاظ سے عام انسانی صورت نہیں تھی۔ اس نے راجہ کو دعوت دی کہ اگر وہ اس کے
پاس چلا آئے گا تو نہ صرف یہ کہ اس کو اپنے تمام سوالوں کا جواب ملے گا بلکہ اس کی تمام
مشکلیں حل ہوں گی۔ نڈر راجا نے اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا کہ وہ
دریا کو کس طرح پار کر سکتا ہے۔ اس دیو پیکر صورت نے اپنی ٹانگ پھیلا کر دریا پر
پل بنایا۔ متحیر مگر نڈر راجا نے اپنی چھری دیو کی ٹانگ میں پیوست کرتے ہوئے دریا
کو پار کر لیا۔ اور اس دیو ہیکل کے قریب آگیا۔ دیو پیکر نے اپنا تعارف کراتے ہوئے
راجا سے کہا کہ وہ بھگوان شو کا غلام و بیتال بھیرو ہے اور وکرمادیتہ اور رشدھر کے بعد
وہ یعنی پرواسین تیسرا شجاع بادشاہ ہے جس کی بہادری سے وہ بے حد متاثر ہوا
ہے۔ چنانچہ اس نے نہ صرف راجا کے نئے شہر کی نشاندہی کی بلکہ آشیرواد دے
کر مہورت کا وقت بھی بتا دیا۔ دوسرے دن راجا بھیرو کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا۔
یہ جگہ ہاری پربت کے ملحق تھی۔ راجہ نے شبھ مہورت پر ملک بھر کے پاک نفس عالموں،
بزرگوں اور مہاتماؤں کی موجودگی میں اپنے شہر کی بنیاد ڈالی۔ نئے شہر کی تعمیر اور آرائش
کا کام وقت کے سب سے بڑے انجنیئر جیہ کے سپرد ہوا۔ شہر کے مرکز میں بھگوان شو کا
ایک مندر تعمیر کروایا جو کافی دنوں تک سکا پر وار سورائے[2] کے نام سے مشہور رہا۔ کچھ عرصے
کے بعد ہاری پربت کے ارد گرد عالی شان عمارتوں اور باغوں کا شہر آباد ہوا۔ اپنے اس
شہر کو آفتوں سے بچانے کے لئے راجا نے نہ صرف اپنے وقت کے روحانی باکمالوں کی
دعائیں حاصل کیں بلکہ مختلف مراکز پر پانچ عظیم الشان مندر تعمیر کروائے اور اس طرح
سے سرینگر کا یہ پرانا شہر جو وقت کے بے رحم تھپیڑوں کے باوجود کھڑا نظر آتا ہے آج

۱۔ THE TALES FROM THE RAJTARANSNI BY S.L.SADHU PASE 32

۲۔ "راج ترنگنی" حصہ دوئم مترجمہ اسٹین صفحہ ۴۴۳ (SIKAPRAYA RESVERA)

سے کوئی تیرہ سو سال پہلے دھرتی کے سینے پر نمودار ہوا راجہ پرواسین نے اپنے نام کو زندہ رکھنے کے لئے اس شہر کو بسایا تھا۔ لیکن وقت نے اپنے سفاک ہاتھوں سے پرواسین کا دیا ہوا نام پردا پور مٹا دیا اور اسے اشوک اعظم کے شہر کے نام سے ہی زندہ جاوید رکھنا مناسب سمجھا۔

اس بات سے قطع نظر کہ ہیون سانگ کے زمانۂ قیام میں سرینگر کس شکل و صورت میں کھڑا تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر جنوب سے شمال کی طرف پھیلا ہوا تھا۔ وتستا اس کو کاٹتی ہوئی گذر جاتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شہر ندی کے دوسرے کنارے پر بھی آباد ہو گیا اور آج صدیاں گزرنے کے بعد شہر کی حدود میں وسعتیں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ وتستا ایک خوبصورت ناگن کی طرح اپنے نیلے پانیوں کے چمکتے ہوئے جسم کو سمیٹتی تھکے قدموں کے ساتھ بہتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا سفر صدیوں پہلے شروع ہو چکا ہے۔ لیکن اس کے چہرے پر تکان یا ملال کے سائے نظر نہیں آتے۔ سرینگر کے ایک طرف ڈل جھیل ہے جس کے کنارے پر پہاڑوں کی بانہوں میں کھلے ہوئے مغلوں کے باغات ہیں جو اپنے رنگوں کی بہار اور چناروں کے ٹھنڈے سائے سے اس میں حسن اور رنگ کی جھالر تان دیتے ہیں۔ شنکر آچاریہ کی پہاڑی، ہاری پربت کا قلعہ، ہندوؤں کے مندر، مسلمانوں کی مسجدیں، سکھوں کے گوردوارے، زیارت گاہیں اور استھاپن، بادام کے شگوفے اور کنول کے پھول، تیرتے ہوئے باغات، ہوس بوٹ اور شکارے اس شہر نگاراں میں قوسِ قزح کے رنگ بھر دیتے ہیں۔ دوسری طرف آنچار کا دودھیلا پانی ہے۔ جو اپنے دودھ سے ہواؤں کو نہلاتا ہے۔

وتستا

وتستا، ویتھ یا جہلم۔ تال اسی خوبصورت دریا پر ٹوٹتی ہے جس سے سرینگر

کی آن بان قائم ہے۔ شہر کے بیچ میں بہتا ہوا صدیوں پرانا دریا ہندو دیومالا میں ایک تیرتھ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ دریا ہے جس کے پانیوں میں ہندوؤں کے اعتقاد کے مطابق ڈبکی لگانے سے پاپیوں کے پاپ دھل جاتے ہیں۔ جہلم کا اصلی نام ویتھ ہے۔ جو سنسکرت کے وِتستا سے ماخوذ ہے اور رفتار زمانہ کے ساتھ لسانی تبدیلیوں کے بعد "ویتھ" بن گیا ہے۔ وتستا کا یہ لفظ رگ وید کے دریائی ناموں میں بھی نظر آتا ہے۔ یونانیوں نے اسے ہیڈاسپس HYDASPES[1] کے نام سے موسوم کیا ہے۔ بعض سنسکرت بولنے والے اسے دوستا بھی لکھتے آئے ہیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ آٹھویں صدی کی چینی تواریخوں میں بھی یہی نام ملتا ہے۔ نیل مت پران' میں کاشمیر (کشمیر) کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے وتستا کو ہمالیہ کی بیٹی اور جہاں دیوی بتایا گیا[2]۔ قدیم کشمیر سے متعلق اس قدیم اینسکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ وتستا شو کی محبوبہ پاروتی کا مظہر ہے قدیم روایات کا ذکر کرتے ہوئے اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ پشاچوں کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں ناگ قوم کے لوگ اپنی ذات کھو بیٹھے تھے اور بہت پریشان تھے ان کی پاکیزگی کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں پرایشچت کرنے کی ضرورت تھی لہٰذا کشیپ رشی نے بھگوان شو کی اپاسنا کر کے پرارتھنا کی کہ وہ دیوی کو پانی کی شکل میں بھیج دیں۔ دیوی پاروتی اپنے مالک کے حکم کے مطابق پانی کی شکل میں ڈھل کر دھرتی کے اسی حصے میں آگئیں۔ زمین کے اندر پناہ لی اور بھگوان شو سے عرض کی کہ وہ ان کو زمین سے باہر نکال لیں۔ چنانچہ بھگوان نے اپنے ترشول کو نیل ناگ کے نزدیک زمین گاڑ دیا جس سے ایک وتاسی (VATASI) یا بالشت کے برابر پانی

---

[1] گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ ص ۲۰۵

[2] نیل مت پران حصہ دوئم مرتبہ ڈاکٹر دید کماری گی ص ۲

باہر پھوٹ آیا اور اس رعایت سے یہ ندی وتستا کہلائی اس سلسلے میں نیل مت پران میں لکھا ہے :-

"کشمیر کو اس طرح آباد دیکھ کر کشپ نے شنکر کی
پوجا کی اور دیوی اُما کو آمادہ کیا کہ اس ملک
کو پانی کے تحفے سے پوتر کردے اور وہ —
جو پاپیوں کو زائل کرنے والی ہے ، دریائے
وتستا کے نام سے مشہور ہے۔" [۱]

شنکر کی خواہش کے مطابق دیوی نے پانی کی صورت اختیار کرلی اور اپنے مالک سے یوں کہنے لگی :-

"اے سنسار کے مالک ! میں پاتال (نیچے کی دنیا)
میں ایک صورت اختیار کرلوں گی تب آپ
نیل کے قریب اپنا ترشول زمین میں گاڑ دیجیے۔
ترشول گڑھنے سے میں پاتال سے باہر نکل
آؤں گی اور اس راستے پر چلوں گی جو اس ہل
سے اس جگہ تک بنا ہے جہاں بڑا دریا سندھو
ہے"۔ شنکر نے خود اس کا نام وتستا رکھا کیونکہ
ہر نے ترشول سے ایک گڈھا بنالیا تھا جو وتاسی
کے برابر کا تھا - اسی سے ہی یہ اچھی ندی پاتال
میں جا چکی تھی ۔ باہر پھوٹ آئی ۔ اس لئے

---

[۱] نیل مت پران حصہ دوئم مرتبہ ڈاکٹر وید کماری گئی صہ ۶۱

اس کا نام شمبو نے خود وتستا رکھا۔" [1]

چشمے کی وہ جگہ جہاں سے پاروتی ندی کی صورت میں جلوہ افروز ہوئی۔ نیل کنڈ، سلگاٹ یا صرف وتستا کہلایا۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چشمہ ویری ناگ نیل ناگ کے گاؤں کے قریب واقع ہے لیکن اصل میں ویری ناگ نہیں ہے۔ جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ویری ناگ ہی وتستا کا منبع ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

ایک روایت کے مطابق دیوی وتستا اس جگہ (ویری ناگ) سے ظاہر ہونا چاہتی تھی۔ لیکن جب وہ یہاں پر آئی تو یہاں پر شو کو بیٹھا پایا۔ لہٰذا اسے واپس جانا پڑا اور اسے ویتھ وترس میں سے پھوٹنا پڑا جو اس جگہ سے شمال مغرب میں کوئی ایک میل دوری پر ایک چشمہ ہے۔ سنسکرت میں "ورہ" کے معنی ہیں واپس جانا اور نگر کے معنی ہیں چشمہ اور چونکہ وتستا کو اسی جگہ واپس جانا پڑا لہٰذا اسے ورہ ناگ یا ویری ناگ کہا گیا۔" [2]

اس روایت کا ذکر راج ترنگنی میں بھی ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وتستا بار بار پاپیوں کے چھوئے جانے سے غصے میں آکر غائب ہوتی رہی لیکن بار بار ہی کشیپ رشی کی پرارتھنا پر نمودار ہوئی اور مختلف جگہوں پر نمودار ہوئی اسی لئے روایات کے مطابق

---

[1] نیل مت پران حصہ دوم مرتبہ ڈاکٹر وید کماری گئی اشلوک ۲۵۷-۲۶۱ صفحہ ۶۷

[2] پی این کے بامزئی ہسٹری آف کشمیر ص ۵۹۷

صحیح منبع کے تعین میں دقت ہوتی ہے۔ راج ترنگنی میں 'ویتھ' ونز کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ اس کی وضاحت سٹائین یوں کرتے ہیں۔

"کلہن اس جگہ کو وتستتر VITASTATRA کہتا
ہے۔ کلہن یہ بھی لکھتا ہے کہ مہاراجہ اشوک
نے یہاں پر ستوپا بھی کھڑے کر دیئے تھے۔
اس نے نیل کنڈ کو وتستا کا منبع قرار دیا ہے
لیکن اس کا ابھی کہیں پر پتہ نہیں چلتا" [۱]

بہر حال جو کچھ بھی ہو۔ وتستا اپنے منبع سے نکل کر کھنہ بل پہنچ جاتی ہے۔ جہاں اس کے ساتھ شمال مشرق سے آرت اور جنوب مشرق سے برینج اور سندرن آ ملتے ہیں۔ اسلام آباد کے دو تین میل شمال میں شیش ناگ سے نکلنے والے نالہ لدر کا دودھیلا پانی اس کے ساتھ آملتا ہے جس سے پانی کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ آگے چل کر بیجبہارہ میں وشو اور رمب آرہ ملتے ہیں۔ سرینگر میں دودھ گنگا، شادی پورہ میں سندھ اور مظفر آباد میں کشن گنگا اسمیں شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح جھیل ڈل، آنچار، مانسبل ولر اور دوسرے بہت سے ندی نالوں کا پانی سمیٹتے ہوئے پاکستان میں جہلم کے مقام پر پہنچ جاتی ہے جہاں اس کا نام جہلم پڑتا ہے۔ وتستا آج اسی نام سے مشہور ہے جہلم سے میدانی علاقوں سے گزرتی ہوئی چناب کے ساتھ مل کر آخر بحیرۂ عرب کی باہوں میں سما جاتی ہے۔ جہلم اپنے منبع سے لے کر چناب کے سنگم تک کوئی طول طویل ۶۲۰ میل لمبا سفر طے کرتی ہے [۲]۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں یہ وادی کے بیشتر حصے میں 'ویتھ' کہلاتی ہے اور میدانی علاقے میں جہلم کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں بارہ مولہ سے لے کر مظفر آباد کے علاقے میں اسے صرف "دریا" کہا

۱۔ راج ترنگنی (حصہ دویم) صفحہ ۴۱۸
۲۔ ایضاً

جاتا رہا ہے [1]

ذکر ہو چکا ہے کہ وتستا کا اصلی نام اب بہت کم لوگوں کی زبان پر ہے اسے اب عام طور سے جہلم ہی کہا جاتا ہے۔ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کے بہاؤ یا اس کی گزرگاہ میں کوئی نمایاں فرق پیدا نہیں ہوا ہے۔ اپنے روایتی تقدس سے قطع نظر اس کی افادیت اور فیض رسانی سے انکار ممکن نہیں۔ یہ دریا صدیوں سے اندرونی تجارت کو بڑھاوا دینے میں اہم رول ادا کرتا رہا ہے اس کے علاوہ آمدورفت کا اہم ذریعہ رہا ہے۔ خاص طور پر اس زمانے میں جب پختہ سڑکوں کا جال بچھا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی آمدورفت کے لئے گاڑیاں، لاریاں اور بسیں وجود میں آئی تھیں سرینگر میں جہلم پر سالہا سال سے سات پل نظر آتے رہے ہیں حتیٰ کہ ان پلوں کی وجہ سے اسے سات پلوں کا شہر کہا جاتا رہا ہے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پلوں کی یہ تعداد پچھلے پانچ سو سال سے ویسی کی ویسی ہے اب حالیہ برسوں میں ان پلوں کی تعداد نو تک پہنچی ہے۔ تواریخی شواہد سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہلم پر کسی زمانے میں تیس پل کھڑے تھے۔ دریائی ٹریفک کے لئے درمیان میں چھوٹا سا راستہ رکھ دیا جاتا تھا۔ تواریخی شواہد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندو حکمرانوں کے دور میں وتستا پر کبھی مستقل پل دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان پلوں کی بڑی خوبی یہ تھی کہ ضرورت کے وقت ان کو کھول دیا جاتا تھا۔ دشمن کی یلغار کا خطرہ ہوتا یا دریا کے کسی پار آتش زدگی کی واردات ہوتی تو شہر کے دوسرے حصے کو بچانے کے لئے کشتیوں کے پل کھول دیئے جاتے اور شہر کے دونوں حصوں کو علیحدہ کیا جاتا۔

کشمیر کے دریاؤں خاص طور پر جہلم کی سطح آب پر مختلف زمانوں میں کشتیاں

---

[1] گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ صفحہ ۲۰۵

استعمال ہوتی رہی ہیں۔ مختلف قسم کی کشتیوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

ہبتر، کھوچ، ڈونگہ، شکارہ، لرِہ ناو، ڈیمبہ ناو، پرندہ، ٹاسہ دار۔

کھوچ، باربرداری کے لئے بڑی کشتی ہے اور عام طور سے شالی اور دوسرے غلہ جات ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ اس کی پشت ڈھلوان ہوتی ہے۔ بعض اوقات دریا میں پانی کی کمی کے باعث یہ کشتیاں پانی کی سطح پر تیر نہیں سکتی ہے۔

کھوچ :۔ بے چھت کی لمبی اور چوڑی کشتی ہے جو بھاری سامان خاص طور سے بالن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ ڈونگہ کشتی بانوں کا گھر ہے۔ ملاحوں کی خاصی تعداد ان میں ہی رہائش کرتی ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ بھی ہوتا ہے اور چھوٹے چھوٹے کمرے بھی۔ سیر و تفریح کے لئے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

شکارہ :۔ ڈونگے کی شکل والی مقابلتاً چھوٹی کشتی جسے سواری کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔

لرِناؤ :۔ اسے ہوس بوٹ بھی کہتے ہیں۔ بہت بڑی کشتی جو بعض اوقات دو منزلہ بھی ہوتی ہے۔ جدید آرائش اور آسائش کے سامان سے مزین یہ کشتی عام طور سے جھیل ڈل اور سرینگر میں جہلم کے بالائی حصوں میں ملتی ہے۔ عام طور سے لرِناؤ سطح آب پر ایک ہی جگہ پر ساکن رہتی ہے۔ بڑے ہوٹلوں کی طرح سیاحوں کے کام آتی ہے۔

ڈیمبہ ناؤ :۔ یہ کشتی عام طور سے جھیل ڈل میں آبی گھاس سمیٹنے کے استعمال میں لائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی سبزی ترکاری اور پھل پھول لینے لے جانے کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہے۔

پرندہ :۔ پرندہ ایک ملکی شاہی سواری ہے یہ عام استعمال کی سواری نہیں

اسے خاص تقاریب پر بڑی آرائش کے بعد استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی زمانے میں شاہی خاندان کے افراد اس کی سواری کیا کرتے تھے۔ آج کل اس کا استعمال دریائی جلوسوں میں کسی سرکاری تقریب پر ہوتا ہے اور اس میں خصوصی مہمانوں کو بٹھایا جاتا ہے۔ ڈاک واری بھی پرندہ کی قبیل کی ہی کشتی ہے۔ دونوں طرح کی کشتیوں کو ملاؤں کی بڑی تعداد کھیتی ہے۔

ٹاسہ وار:۔ مقابلتاً چھوٹی ہلکی اور تیز رفتار کشتی ہے۔

ولستا کے روایتی تقدس کا احترام صدیوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ کسی زمانے میں بھادوں کے روشن پندرہواڑے کی تیرہویں تاریخ (ستمبر۔ اکتوبر) کو ایک تہوار روایتی دھوم دھام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ اس تہوار کو ویتھ ترواہ یا ولستا تریوویشی کہا جاتا تھا۔ ولستا کو دودھ اور مٹھائیوں کا بھوگ چڑھایا جاتا تھا۔ جہانگیر نے تزکِ جہانگیری میں اس تہوار کا ذکر کیا ہے۔ بڈشاہ کے زمانے میں بھی بڑے تزک و احتشام کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ بادشاہ خود بھی اس تہوار میں شریک ہوتا تھا۔ آر کے پارمو رقمطراز ہیں:۔

> "زین العابدین چراغوں کی نمائش میں شریک
> ہوتا تھا۔ یہ تہوار ولستا کے جنم لینے کی خوشی
> میں منایا جاتا تھا جو بھادوں کے روشن پندرہواڑے
> کی تیرہ تاریخ کو پڑتا ہے۔ اس تہوار کو 'ویتھ تراوہ'
> کہتے ہیں۔" [1]

آر کے پارمو سر والٹر لارنس کے حوالے سے ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ لارنس کے زمانے (۱۸۵۵ - ۱۹۰۵) میں اس دن یعنی 'ویتھ تراوہ' کو والدین اپنی

---

[1] آر کے پارمو:۔ ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر صفحہ ۱۴۳

بیٹیوں کو تحفے تحائف بھی دیا کرتے تھے۔ ؎۱

اس تہوار میں رنگ و نور کا اجتماع ہوتا تھا اور مذہب، ذات اور طبقوں کے بھید بھاؤ کے بغیر لوگ تہوار میں شریک ہوتے تھے اور خوشیوں اور شادمانیوں سے اپنا دامن بھر لیتے تھے۔ کشمیر کے رنگا رنگ تہواروں کا ذکر کرتے ہوئے بامزئی نے اس تہوار کو خاص طور پر بیان کیا ہے۔ سری ور کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> "چاند کی تیرھویں رات کو بادشاہ چراغوں کی اس نمائش کو دیکھا جاتا تھا جو وتستا کے جنم دن کی پوجا کے موقع پر ہوتی تھی۔ وہ کشتی میں سوار ہو کر راجدھانی کی طرف جاتا تھا۔ سطح آب پر تیرتے ہوئے گیت سنتا تھا۔ اور کشتی پر سوار ہونے سے پہلے یا بعد میں شہریوں کی دعائیں لیتا تھا........ دریا کے کنارے پر جلتے ہوئے چراغوں کی قطاریں حسین لگتی تھیں اور ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وتستا کی پوجا کے لئے دیوتاؤں نے سنہری پھول بکھیر دیئے ہوں۔" ؎۲

جھیل ڈل اور آبی راستے

وادی کشمیر میں بڑی اور چھوٹی بے شمار خوبصورت جھیلیں ملتی ہیں۔ سرینگر

؎۱ آر کے پارمو: ہسٹری آف مسلم رول ان کشمیر ص ۱۴۳

؎۲ گزیٹیر آف کشمیر اینڈ لداخ ص ۲۷

کا شہر بھی اس نعمت سے خالی نہیں۔ جھیل ڈل اور آنچار سرینگر کی حدود میں شامل ہیں لہٰذا ان کا ذکر ناگزیر ہے۔

ڈل

کشمیری زبان میں ڈل کا لفظ جھیل کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ یہ اصل میں ایک تبتی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ساکن[1] ٹھہرا ہوا روایت ہے کہ یہاں کسی زمانے میں ایک چراگاہ تھی جس کا نام وتالن مرگ تھا۔ ایس ایل سادھو قدیم روایات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"کہا جاتا ہے کہ ڈل جھیل کا اس زمانے میں
وجود نہ تھا اور اس جگہ پر ایک چراگاہ موجود
تھی جس کا نام وتالن مرگ تھا اور بعد میں ایک
زبردست بھونچال سے چراگاہ میں پانی بھر گیا
اور اس نے ایک جھیل کی شکل اختیار کر لی"۔[2]

جھیل ڈل کی لمبائی شمال سے جنوب کی طرف کوئی ساڑھے پانچ میل ہے اور چوڑائی مغرب سے مشرق کی طرف کوئی دو سے تین میل تک ہے پانی صاف وشفاف ہے کیونکہ اس کی تہہ میں بہت سے چشمے ابلتے ہیں۔ مارسر کی جھیل بھی ڈل کو اپنے پانی کی ٹھنڈک بہم پہنچاتی ہے۔ یہ جھیل کئی حصوں میں منقسم ہے۔ چھوٹا ڈل، بڑا ڈل، ڈل کٹوال وغیرہ وغیرہ۔ گگری بل کی طرف پھیلے ہوئے ڈل کا حصہ بڑے ڈل سے ایک بنڈ کے ذریعے سے کٹا ہوا ہے۔ گگری بل کی سمت کا ڈل جنوب اور مشرق کو پھیلا ہوا ہے اور بڑا ڈل مشرق کی سمت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بنڈ پرانے وقتوں

---

1. TALES FROM RAJTARANGNI P. 33
2. پی این کے بامزی ہسٹری آف کشمیر ص ۵۱۴

میں کسی متمول کشمیری پنڈت نے تعمیر کروایا تھا۔ یہ بنڈ نایدکدل سے شروع ہو کر ڈل کے دوسرے کنارے نشاط سے ذرا ہٹ کر الیشبر گاؤں تک کوئی ساڑھے تین میل لمبا ہے۔ ڈل کے پانیوں میں دو چھوٹے جزیرے بھی ملتے ہیں سونہ لنک اور روپہ لنک یہ اپنے پُر بہار سبزے اور چنار کے گھنے سایوں کے باعث انسانی نظر دلسا کو ایک لمحے کے لئے روک لیتے ہیں روپہ لنک کو اپنے چار چناروں کی وجہ سے چار چناری بھی کہتے ہیں۔ چھیل ڈل ایک دل فریب جھیل ہے۔ اس کے تین اطراف ہیں،۔۔۔۔ پہاڑوں کے سلسلے پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک طرف شنکر آچاریہ کی پہاڑی نظر آتی ہے جس کی چوٹی پر پرانے وقتوں کا شومندر دور سے دکھائی دیتا ہے۔ اس پہاڑی کو تخت سلیمان بھی کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف ہاری پربت کی پہاڑی ہے۔ مغلوں کے ذوق جمال نے ڈل کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ان کے بنائے ہوئے باغات ڈل کے کنارے پر دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ نشاط، شالیمار، چشمہ شاہی، نسیم باغ، نگین، پری محل، اور دوسرے باغات (جو شدائد زمانہ سے اب مٹ چکے ہیں) ان باغوں کا جاہ و جلال، وجاہت۔ اور خوبصورتی دور دور سے لوگوں کے دامن دل کو کھینچ لیتی ہے۔ یہاں کی ہر صبح صبح بنارس ہے اور ہر شام شام اودھ، صبح بنارس اور شام اودھ ایک بھرم ہو تو ہو لیکن یہاں کی ہر سحر یہاں کی سحر ہے اور یہاں کی ہر شام یہاں کی شام ہے اور صبح و شام کا طلسم یہاں پر ختم ہے۔

آنچار

سرینگر کے شمال و مغرب میں ایک دودھیلے پانی کی شفاف جھیل آنچار ہے۔ یہ جھیل دریائے سندھ کے علاوہ پانی کے امنڈنے سے تشکیل پاتی ہے۔ تکونی

شکل کی اس جھیل کا نوک دار سر اسرینگر کی حدود کے ساتھ دور دور تک پھیلا ہوا ہے اس کی زیادہ سے زیادہ لمبائی ۷ میل اور چوڑائی ۵ میل ہے۔ کسی زمانہ میں سرینگر کے گرد گھومتا ہوا نالہ مار اسی جھیل میں سما جاتا تھا۔ آنچار ایک گہری جھیل ہے اور مچھلیوں کے شکار کے لئے بہت مشہور ہے۔

جہلم ڈل اور آنچار کے علاوہ سرینگر میں اور بھی کئی آبی راستے ہیں۔ ان سے زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک برابر آمد و رفت اور رسل و رسائل میں کافی سہولیت ہوتی رہی ہے۔ سڑکوں کا جال بچھ جانے سے اب ان کی افادیت کم ہو گئی ہے اور ان کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے چند ایک اہم نالے یہ ہیں:۔

کٹہ کول

یہ ایک چھوٹا سا آبی راستہ ہے جو جہلم کے بائیں کنارے سے شیر گڈھی کے شاہی محلات کی دیواروں کے ساتھ سر ٹیکتا ہوا الگ راستہ اختیار کر لیتا ہے اور ڈنگی کدل گلاب باغ سے ہوتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔ اس کی ایک شاخ مغرب میں بہتی چلی جاتی ہے اور سید منصور کی زیارت کے قریب دو حصوں میں بٹ جاتی ہے مغربی شاخ سونہ کول کہلاتی ہے۔ جو چھوٹی اور کم گہری ہے دوسری شاخ سید منصور کے پل سے گزر کر درشی کدل سے بہتی ہوئی چھتہ کل سے ملتی ہے۔ کٹہ کول کی اصلی شاخ شمالی سمت سے بہتے ہوئے پھر مغرب کی طرف چلی جاتی ہے اور صفاکدل کے نزدیک جہلم کے ساتھ پھر مل جاتی ہے۔ اس آبی راستے سے جہلم کے بائیں طرف کی اندرونی آبادی مل جاتی ہے۔ آبی راستوں کے کم استعمال کئے جانے کی وجہ سے اب اس کا استعمال بھی کم ہو گیا ہے سرینگر کے بالائی حصوں سے چلنے والی کشتیاں جن کو شہر سے باہر جانا ہو اسی راستے کا عام طور سے استعمال کرتی ہیں۔ راج ترنگنی میں کٹہ کول کا نام (کسپٹیکا کیولیا)[1] ہے

---

[1] KSIPTI KAKULYA

بنایا گیا ہے۔ کلہن کا خیال ہے یہ کٹہ کول دراصل شہری تحفظ کی ایک قدرتی لائن تھی اور جہلم سے خود بخود الگ ہو گئی ایسا لگتا ہے کہ اس کے زمانے میں دشمنوں نے سرینگر شہر کا محاصرہ کیا تھا۔

نالۂ مار

سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی یہ "سانپ کی نہر" ڈل کے جنوب مغربی حصے سے گزرتی تھی۔ یہ نالہ کئی شاخوں میں بٹا ہوا تھا اور سارے شہر کے اندرون کو ملاتا تھا۔ یہ شہر میں سے گزرنے والا سب سے بڑا نالہ تھا اور ڈل اور آنچار کو ملاتا تھا۔ یہ نالہ آمد و رفت کا ایک اہم ذریعہ ہونے کے علاوہ اندرونی تجارت کو بڑھانے میں بڑا مفید تھا۔ ابھی حال میں پانی کم ہو جانے کی وجہ سے اس کی افادیت ختم ہو گئی تھی اور اس کو بند کر کے ایک گول سڑک تعمیر ہوئی ہے۔

ژونٹھ کول

یہ کول جھیل ڈل کو وتستا کے ساتھ ملاتی ہے۔ پرانے وقتوں میں اس کو مہا سارت کہا جاتا تھا۔ اس جگہ یہ چھوٹی سی ندی ایک جزیرہ بناتی تھی جسے کلہن کے زمانے میں ماک سی کاس وامن MAKSIKASVAMIN کہا جاتا تھا اور اب اسے مائیسمہ کہتے ہیں۔ جس جگہ پر وتستا اور ژونٹھ کول ملتی ہے اس کو پرانے وقتوں میں ایک مہان تیرتھ مانا جاتا تھا اور 'مان کھا' کے نام سے موسوم تھا اس کا دوسرا نام ماری سام گامس MARISAMGAMAS[1] بھی تھا۔

---

[1] راج ترنگنی (حصہ دوم) مترجمہ ارل سٹین ص ۴۱۶

دودھ گنگا

وتستا کے بائیں کنارے سے صرف چند سو گز دور دودھ گنگا کا نالہ ملتا ہے۔ کلہن کے مطابق اس کا پرانا نام "دھگدھ سندھو" ہے اور اس کا منبع چیٹا پتھر (سنگ سفید) ہے جو پوس مرگ کی طرف ایک پہاڑی چشمہ ہے۔ تحصیل چاڈورہ سے ہوتے ہوئے جنگلی پتھروں سے ٹکرا کر چور چور ہوتے ہوئے سرینگر سے گزرتا ہے۔ سرینگر میں اسے چھتہ کول بھی کہا جاتا ہے کیونکہ چھتہ بل سے گزرتا ہے۔ سرینگر میں اس نالے میں کشتی رانی بھی ہوتی ہے۔ جس جگہ پر وتستا کے ساتھ اس کا سنگم ہوتا ہے وہ کسی زمانے میں ایک بڑا تیرتھ تھا اور "وید ہ مٹھ" کہلاتا تھا۔

کلہن اور راج ترنگنی

وقت کی بیکراں وسعتوں کو چیرتے ہوئے جب نظر ماضی کے دھندلکوں کو ٹٹولتی ہیں۔ تو علم و عرفان کے بے پناہ سرچشمے ابلتے ہوئے ملتے ہیں اور ان نظر فریب شادابیوں کو لازوال بناتے ہیں جو جنتِ ارضی کے ہر ذرے میں رچے ہوئے ہیں۔ فلسفہ فن، علم، فضل کون سا شعبہ ہے، جہاں ہمارے اسلاف نے چراغ نہ جلائے ہوں۔ ناگ ارجن، اشو گھوش، چرک، ولبھ دیو، بھیم بٹ، داسو گپت، بھاسکر آچاریہ، ابھینو گپت، کھشمندر، بلہن اور ایسے ہی بیسوں عالم و فاضل تابندہ ستاروں کی ایک کہکشاں ہے، جو ہمارے نیلے آسمان کے نیچے چمک کر دور دور تک نور کی لکیریں پھیلاتی رہی۔ ان ہی روشن دماغوں میں کلہن پنڈت کا نام بھی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ جو آج سے لگ بھگ ۸۳۲ سال قبل ہماری سرزمین میں پیدا ہوا اور اپنے کارناموں کے لئے صدیوں تک زندہ رہے گا۔

کلہن کا کارنامہ اس کی شہرہ آفاق تصنیف راج ترنگنی ہے۔ جس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کی ٹکر کی منظوم تواریخ آج تک کسی زبان میں نہیں لکھی گئی ہے ۷۸۲۶، اشلوکوں پر مشتمل یہ کتاب شاعری کے میڈیم میں تواریخ کے پانچ ہزار برسوں کو سمیٹتی ہے۔ اس عظیم کارنامے کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ شاعری کے لوازمات کو برتتے ہوئے اس میں کشمیر کی قدیم تواریخ کو پیش کیا گیا ہے، یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ عالمی ادب میں اس طرح کے شاہکار اگرچہ نایاب نہیں کم یاب ضرور ہیں۔ پنڈت نہرو اس کتاب کو تواریخی، سماجی اور معاشیاتی معلومات کا خزانہ قرار دیتے ہیں۔[1] مشہور مورخ آر، سی، مجمدار اس کی عظمت کا اعتراف یوں کرتے ہیں:

"ہندوستان کے قدیم ادب میں یہ واحد کارنامہ ہے، جسے صحیح معنوں میں ایک تواریخی نسخہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مصنف نے نہ صرف موجودہ مسودوں اور دوسرے ماخذات سے مواد جمع کیا ہے۔ بلکہ کتاب کے ابتدائی صفحات میں ان چند اصولوں کا ذکر بھی کیا ہے، جو یہ تواریخ لکھتے وقت اس کے پیش نظر رہے۔ ان اصولوں کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد سے کہیں آگے تھا۔ بلا شبہ یہ اصول ایسے ہیں جو انیسویں صدی تک تاریخ کے تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ کے لئے بروئے کار نہیں لائے

---

[1] R.C. PANDITA : RIVER OF KINGS (INTRODUCTION) PAGE 12

جاتے تھے"[1]

راج ترنگنی آٹھ ترنگوں میں تقسیم ہے۔ ہر ترنگ کے اختتام پر لکھا ہے:۔

راج ترنگنی کی پہلی ترنگ ...... اختتام پذیر ہوتی ہے۔ جسے کشمیر کے مایہ ناز وزیر چمپک کے بیٹے کلہن نے تصنیف کیا۔"

راج ترنگنی سنسکرت شاعری کا ایسا کارنامہ ہے جس میں کشمیر کی تواریخ کے مختلف ادوار کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اپنی تمام خامیوں کے باوجود یہ تصنیف کشمیر کے حکمرانوں کے دور حکومت کو ۱۱۴۸ تک سمیٹ لیتی ہے جب کلہن نے اسے تصنیف کیا ہے اور بعض بے ربطیوں کے باوصف یہ تصنیف کشمیر کی تواریخ کا ایک سلسلہ وار تذکرہ ہے والٹر لارنس اس بات کا ذکر یوں کرتے ہیں:۔

"کشمیر میں ابتدائی سلطنتوں کے روایتی کرداروں اور مصنوعی تاریخ وار سلسلہ واقعات کو رد کرتے ہوئے جو پہلی ترنگوں میں ملتے ہیں اور جو تاریخی تنقید کی تند آندھی کے باوجود آزمائشوں میں پورے اترے ہیں، اس کتاب کو ساتویں صدی عیسوی کے مابعد ایک معتبر یادداشت تسلیم کیا جاسکتا ہے"[2]

راج ترنگنی کے فاضل مترجم ارل سیٹن کے مطابق کلہن نے اس کتاب کا مقدمہ ۴۲۲۴ لوکیکا مطابق ۱۱۴۸-۱۱۴۹ء میں لکھا اور اسے دو برس میں مکمل کیا۔

---

[1] R.C. MUZAMDAR : THE VEDIE AGE PAGE. 44

[2] والٹر لارنس۔ ویلی آف کشمیر صفحہ ۱۸۰

یہ راجا جے سمہا کا دورِ حکومت تھا۔ یہ صحیح ہے کہ کلہن کشمیر کا پہلا مورخ نہیں ہے بلکہ اس سے قبل کئی لوگوں نے تاریخ جیسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ کلہن نے خود اپنے پیش رو مورخین کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایسا کوئی کارنامہ منظرِ عام پر نہیں آیا ہے، اس لئے راج ترنگنی کو کشمیر کی تاریخ سے متعلق اولین ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ تاریخ نویسی ایک مشکل اور صبر آزما فن ہے اور زبردست ریاضت کا متقاضی ہے اس کے لئے مورخ کو کئی ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس زمانہ میں کشمیر میں تاریخ نویسی کا رجحان پیدا ہوا وہ دور اپنے محدود وسائل کے باعث کافی مشکلات کا دور تھا۔ رسل و رسایل کی دقتیں تاریخی مواد کی نایابی، مخطوطات اور دوسرے ماخذات کی کم یابی جدید سائینٹفک اور تواریخی ذہن کی عدم موجودگی میں یہ کام انتہائی کٹھن تھا۔ اس لئے کلہن سے قبل جن لوگوں نے تاریخ جیسے موضوع پر قلم اٹھایا۔ ان کا کام کارنامے کی حیثیت اختیار نہ کر سکا۔ اور وقت کی بے پناہ وسعتوں میں گم ہو گیا۔

کلہن پنڈت ازل سے ہی زبردست ذہانت اور ذکاوت لے کر آیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اسے شعر کہنے میں قدرت حاصل تھی۔ بلکہ شعر کے قالب میں تاریخ جیسے موضوع کو سمیٹنا اس کی ذہانت اور ذکاوت پر دال ہے۔ کلہن کا کمال یہ ہے کہ اس نے اپنی راج ترنگنی میں تاریخ نویسی کے اصول وضع کئے اور ان سے بحث کی۔ اس کے ساتھ ہی ان ماخذات کی نشان دہی کی جن سے اس نے استفادہ کیا ہے، کلہن نے اپنے دور کے محدود وسایل کے باوصف اس دور کے سکوں، پٹوں اور اپنے پیش رو مورخوں سے اکتسابِ فیض کیا ہے۔ اس کا اعتراف اس نے فراخدلی اور خلوص کے ساتھ کیا ہے۔

سر ارل سٹین کے مطابق کلہن بارہویں صدی کے آغاز میں پرہاس پور

(موجودہ پرس پور) میں پیدا ہوا۔ حتمی طور پر اس کی تاریخ ولادت معلوم نہیں ہے راج ترنگنی ۱۱۴۸ء میں لکھی گئی' قیاس غالب ہے کہ کلہن اس زمانہ میں شباب کی سرحدوں سے گزر چکا تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کلہن کی پیدائش بارہویں صدی کے آغاز میں ہوئی ہوگی۔ یہ وہ دور تھا جب مہاراجہ ہرش (۱۰۸۹-۱۱۰۱ء) اور اس کے پیش رو بادشاہوں کی من مانیوں سے کشمیر میں غارت گری کا بازار گرم تھا۔ ہرش کے بعد اس کے رشتے کے بھائیوں' سہیل اور اُچل نے سارے ملک میں خون ریز بغاوت شروع کر دی تھی۔ ڈامروں نے اپنے مظالم سے نظامِ سلطنت کی بنیادیں کمزور کر دی تھیں۔ کلہن کا شباب اسی افراط و تفریط میں گزرا۔ اس کے والد کا نام کاشمیر کے مہا ماتی چین پک یا چمپک تھا۔ جو مہاراجہ ہرش کے دور میں دوارپتی یا شہر کے دروازے کا داروغہ تھا' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرحدی علاقے کا دفاعی افسر تھا۔ اس بات کے باوجود کہ مہاراجہ ہرش کے ذمہ دار عملے نے سازشوں سے کام لیا۔ وہ ودرد علاقے میں دگدھ گھاٹ کا محاصرہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ اس زمانے میں جب مہاراجہ ہرش چاروں طرف مایوسیوں سے گھرا ہوا تھا۔ چمپک نے ایک نمک حلال اور وفادار ساتھی کی طرح راجہ کا ساتھ دیا۔

کلہن کا اصلی نام کلیان بتایا جاتا ہے۔ ارل سٹین کے مطابق یہ اپ بھرنش کا لفظ ہے جو پراکرت لفظ "کلان" سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بشاش بابرکت وغیرہ ہے[1] وہ برہمن نسل تھا اور شیومت سے بے پناہ عقیدت رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ راج ترنگنی کی ہر ترنگ کا آغاز شیو اور پاروتی کے مبارک نام سے کرتا ہے' لیکن مذہب کے معاملات میں وہ بے حد آزاد خیال تھا۔ وہ بودھ دھرم کا احترام اسی جذبے سے کرتا تھا۔ جس جذبے سے برہمن مت سے

[1] مارک اسٹائن: راج ترنگنی جلد اول ص ۱۲

محبت کرتا تھا۔ دراصل کلہن کے خاندان میں یہی روایت چلی آرہی تھی کلہن کا چچا کنک راگ ودیا کا ماہر تھا۔ وہ راجہ ہرش کا درباری سنگیت کار تھا۔ حتیٰ کہ راجہ ہرش خود بھی اسی سے موسیقی میں درس لیا کرتا تھا۔ کنک بودھ دھرم کا پیرو تھا۔ کلہن اپنی خاندانی روایات کے باعث ہندو اور بودھ مت کے گہوارے میں پل کر پروان چڑھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں دونوں دھرموں کے تیئں عقیدت اور احترام کا جذبہ ملتا ہے۔ کلہن نے جگہ جگہ مہاتما بدھ اور اس کے دھرم کا ذکر انتہائی محبت اور احترام سے کیا ہے۔

کلہن بہت بڑا عالم اور فاضل تھا۔ سنسکرت زبان پر زبردست قدرت رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ دوسرے کئی علوم سے بھرپور واقفیت رکھتا تھا۔ چنانچہ عروض، صرف، نحو، معاشیات، شعریات اور جنیات پر اسے مکمل گرفت حاصل تھی اس کے ساتھ ساتھ وہ مصوری، رقص، موسیقی اور کئی دوسرے فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ اسے اپنے عہد اور اپنے ماقبل عہد کے سنسکرت ادب پر بھی گہری نظر تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں خوبصورت اور سحر انگیز شاعری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

ہرش کے والد چیک نے اپنے زمانے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے اور ملکی نظم و نسق میں دسترس حاصل کی تھی۔ لیکن کلہن کو ایسا زمانہ حاصل نہ ہوسکا۔ وہ ایسے زمانے میں پلا بڑھا۔ جب سیاسی اور سماجی نظام درہم برہم ہوچکا تھا۔ اس لئے وہ اس میدان میں اپنے جوہر نہ دکھا سکا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنا اظہار چاہتا تھا۔ چاروں طرف دروازے بند پاکر وہ شعر و شاعری کرنے لگا اور اسی وسیلہ اظہار میں اس نے تاریخ نویسی شروع کی سر ارل سٹاین رقم طراز ہیں:۔

"ناموافق سیاسی حالات اور غالباً خاندانی

مصلحتوں نے اس پر فوج اور انتظامیہ کے
دروازے بند کر دیئے تھے۔ اسی لئے موروثی
مذاق کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی ادبی صلاحیتوں
کو بروئے کار لاکر اپنے ملک کی تواریخ کے
بارے میں روایات کو قلم بند کرے اور ان
ادوار پر اپنے خیالات کا اظہار کرے جن میں
سے وہ زندگی گزار چکا تھا۔"[1]

کلہن ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہونے کے علاوہ ایک قابل تاریخ نویس تھا۔ کشمیر کی پرانی تواریخ سے جانکاری حاصل کرنے کے لئے کلہن کی راج ترنگنی کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ کلہن روایت اور تواریخ کے درمیان حد فاصل مقرر کرنے میں ناکام رہا ہے اور یہ کہ حالات اور واقعات کے تسلسل میں خامیاں موجود ہیں۔ کوئی سنجیدہ ذہن اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ کلہن اپنے آس پاس کی زندگی سے نابلد تھا۔ وہ ایک بے باک صاف گو اور باضمیر مورخ تھا اس نے کشادہ دلی سے اعتراف کیا ہے کہ اس نے اپنے پیش روؤں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ خاص طور پر مہا تما اور حیرت اور اس طرح کے مسودات سے استفادہ کیا ہے۔ کلہن نے اس سلسلے میں گیارہ کارناموں کا ذکر کیا ہے۔[2] جن سے اس نے اپنا چراغ جلایا ہے۔ جدید تواریخی نقطہ نظر کے مطابق سنسکرت میں تواریخی مواد موجود نہیں ہے اس خیال کے مطابق راج ترنگنی میں بھی کوئی

---

[1] سرارل سٹین، راج ترنگنی جلد اول صد ۲۱

[2] سرارل سٹاین: راج ترنگنی جلد اول صد ۲۴

تواریخی مواد نہیں ہے، لیکن ایسا کہنا کلہن کی عظمت سے انکار کرنے کے مترادف ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ کلہن کے زمانہ میں تاریخ نویسی کے اصول مقرر نہیں تھے۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ کلہن نے خالصتاً تاریخ نہیں لکھی ہے بلکہ کشمیر کے راجاؤں کی کہانی رقم کی ہے۔ اسی لئے کلہن اپنی تصنیف کو "راجوں کا دریا" کہتا ہے، لیکن راجوں اور مہاراجوں کے عروج وزوال کی کہانی ہونے کے باوصف راج ترنگنی کی تواریخی اہمیت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ کلہن نے ماضی کے اس دور کی سیاسی، سماجی اور مذہبی زندگی کے بارے میں براہ راست کوئی بات نہیں کہی ہے۔ لیکن راجاؤں کے ادوار کے ذکر میں کسی نہ کسی پہلو سے عوامی زندگی کا بالواسطہ ذکر ضرور آیا ہے۔ اس نے انتہائی جرأت اور بے باکی کے ساتھ اپنے عہد کے حالات کا جائزہ لیا ہے کلہن راجہ سہیل (۱۱۱۲ سے ۱۱۲۸ء) اور راجہ جے سمہا (۱۱۲۸، ۱۱۴۹) کے عہد کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا اور اسی عہد کا اسے شعوری اور براست مشاہدہ تھا اس لئے اس نے اس پورے عہد پر بھرپور تنقید کی ہے۔ اس نے امیروں کو تضحیک کا نشانہ بنایا ہے اور بادشاہوں کی کوتاہیوں کو بے نقاب کیا ہے۔ بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح کی باتوں کا اظہار کلہن نے کیا ہے، وہ اس زمانے میں سزا دلانے کے لئے کافی تھیں؛[1]

کلہن کے ضمیر اور ایمان کی توانائی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ اس نے جاہ وحشمت اور انعام واکرام کی پروا کئے بغیر اپنے زمانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ وہ سارے ملک میں گھوما اور نہ صرف اپنے زمانے کے مندروں، ستونوں اور مقدس مقامات کی سیر کی، بلکہ پرانے کھنڈرات کی خاک بھی چھان

[1] پی، این، کے بامزی، اے ہسٹری آف کشمیر صفحہ ۲۵

لی اور ان معلومات کو پوری جزئیات کے ساتھ سمیٹ لیا۔ اس سے اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا قایل ہونا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں کلہن کے ان فقروں پر بھی غور کیجیے، جن سے اس کے ذہن اور فکر کی نشان دہی ہوتی ہے۔

"وہ شریف الطبع شاعر قابل ستایش ہے
جس کے الفاظ ایک سچے منصف کی طرح زمانہ
قدیم سے متعلق حق گوئی کرتے وقت محبت
یا نفرت کے جذبات سے احتراز کرتا ہے۔"[1]

کلہن کے نزدیک شاعری کا معیار یہ ہے کہ شاعر حق گو اور اپنے جذبات سے بالاتر رہ کر حق گوئی سے واقعات و حالات کا تجزیہ کرے۔ اس اصول کا اطلاق اس نے خود اپنی شاعری پر بھی کیا ہے، وہ بادشاہوں اور ان کے قایم کیے ہوئے سیاسی نظاموں کی خامیوں کی پول کھولتا ہے اور جھوٹ اور فریب کے طلسم سے کبھی مرعوب نہیں ہوتا وہ راجہ ہرش کو بھی معاف نہیں کرتا۔ حالانکہ اس کے ہاتھوں اس کے خاندان کے وقار میں اضافہ ہوا تھا۔[2] وہ بڑے سلیقے سے ان تمام عناصر کا "مونڈن" کرتا ہے۔ جو اس کی نظروں میں مشکوک اور قابل نفرت ہیں۔ وہ اپنے دور کے سرکش اور ظالم ڈامروں کو تضحیک کا نشانہ بناتا ہے۔ جنہوں نے ملک میں خانہ جنگی کی آگ لگائی تھی۔ وہ برہمنوں کی عامرانہ ذہنیت کی دھجیاں اڑاتا ہے۔ وہ ان تمام طبقوں کے مظالم اور غیر انسانی سلوک کو بے نقاب کرتا ہے جو عوام کا استحصال کرتے ہیں لیکن جہاں کہیں انصاف رواداری محبت حب الوطنی

---

[1] پی، این کے بامزی: اے ہسٹری آف کشمیر ص ۳۵

[2] الفناً

اور بھائی چارے کے واقعات سامنے آئے ہیں۔ کلہن نے بخل سے کام نہیں لیا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے لئے داد و تحسین کے موتی لٹاتا ہے۔

کلہن کو کبھی درباروں میں جانے کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی اس نے اس بات کو اپنی سعادت سمجھا۔ کلہن نے اس سعادت کو حاصل کرنے کے لئے کوئی کوشش بھی نہیں کی اس نے بادشاہ وقت کی ثناخوانی نہیں کی اور نہ ہی مبالغہ آمیز قصاید کے دفتر تیار کئے کلہن کی حق گوئی اور بے باکی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے زمانہ کے راجاؤں کے ذاتی کردار پر مورخانہ ایمانداری سے قلم اٹھایا جس انداز نظر کو سامنے رکھ کر کلہن نے اپنے اس عظیم کارنامے کو پیش کیا اس کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ کبھی بھی شاہی کرم فرمائی کی توقع نہیں رکھتا تھا سلہ لیکن یہ بات بھی تسلیم کرنا ہوگی کہ ہر اچھی بات اور ہر اچھے کام کے لئے اس نے تعریفوں کے دریا بہائے ہیں۔

اس بات کے باوصف کہ کلہن کو وہ زمانہ ملا جب سیاسی اعتبار سے کشمیر میں زبردست اتھل پتھل تھی، اس نے اپنی پسند ناپسند کو اپنی تصنیف کا معیار نہیں بنایا بلکہ ایک منصف مزاج اور روشن ضمیر مورخ کے منصب کو پوری ذمہ داری کے ساتھ نبھایا۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنے چاروں طرف کھلی آنکھ سے دیکھا اتنا ہی نہیں اس نے اپنے ذہن اور ضمیر کے دریچے بھی کھول دیئے۔ کلہن نے صدیوں کے تاریخی واقعات کو شاعری کے پورے لوازمات کے ساتھ جس طرح سنگار کیا وہ اس پر ختم ہے، اس کا یہ عظیم کارنامہ صدیوں تک فراموش نہیں کیا جاسکتا ——— ●

سلہ ارل سٹاین: راج ترنگنی جلد اول صد ۱۷

لل دیدؔ ۔ افسانہ یا حقیقت

تسَ پد مان پورِ چِہ للے
تمہِ گلہِ گلے امرت چوٚو
شوِ ژورُن تھلِ تھلے
تیُتھ منے ور دِتو دِ و د

(پدمان پور کی اس للّہ کو آفرین، جس نے امرت کے
گھونٹ پی لئے اور کائنات میں شوِ کو پانے کی جستجو کی۔
اے پروردِگار! مجھے بھی ایسا ہی ذوقِ جستجو عطا کر)۔

——— (شیخ العالمؒ)

۱؎ دید (کشمیری) اردو میں دید لکھا جاتا ہے۔ اس کے معنی ماں کے ہیں۔ اس لئے لل دید
بمعنی لل ماں کے ہیں۔ کشمیر میں للہ عارفہ کو اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چھ سو سال قبل شیخ العالم جیسی پاک نفس شخصیت نے جنگلوں کے سناٹوں اور بستیوں کے ہنگاموں میں گھومنے والی ایک ننگ دھڑنگ، آوارہ گرد اور اپنے آپ سے بے خبر مجذوبہ کے ذوقِ طلب کو مندرجہ بالا اشعار میں، خراجِ تحسین پیش کیا تھا جس نے اپنے روحانی تجربوں اور باطن کی چھپی ہوئی روشنی کو پہلی بار کشمیری زبان میں ایک انوکھے اور رسیلے انداز میں ڈھالا تھا۔ یہ آواز اپنے نرالے آہنگ اور رسمسے لہجے کی دھیمی آنچ میں لپٹی ہوئی ایک بالکل نئی آواز تھی جس نے نہ صرف اپنے عہد کے بلکہ اس زمانے سے لے کر آج کے لمحوں تک برابر لوگوں کو برمایا ہے۔ اپنے ظاہری وجود سے بے پرواہ اور اپنے حقیقی معبود کے برہ میں سلگتی ہوئی یہ خاتون پدماوتی تھی جس نے چودھویں صدی کے وسط میں جنم لیا تھا اور جسے کشمیر میں للہ ایشوری یا لل دید کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

چودھویں صدی اپنے جلو میں کشمیر کے لئے اضطراب اور انتشار لے آئی تھی۔ اس صدی کے آغاز سے ہی کئی سیاسی اور سماجی انقلابات رونما ہوئے جن سے کشمیر کی تاریخ بے حد متاثر ہوئی۔ شاہ میر نے راجہ اودین دیو کی بیوہ کوٹارانی کو تخت سے ہٹا کر اسلامی حکومت کا پہلا پتھر رکھا۔ یہ ۱۳۳۹ء کی بات ہے۔ اسی زمانے میں میر سید علی ہمدانی رح اور ان کے ساتھی کشمیر آئے۔ ان کی آمد سے اسلام کی تبلیغ کا کام شروع ہوا۔ صدیوں پرانی ہندو اور بودھ تہذیب کے اثرات کم ہونے لگے اور ایک نئے طرز فکر کا آغاز ہوا۔ شروع شروع میں بودھ مت اور ہندوؤں کے ترک فلسفے سے جو نظام زندگی مرتب ہوا تھا وہ اسلامی فکر کے ساتھ شدت کے ساتھ منہدم ہوا۔ افکار کے اس تضاد نے یہاں کے لوگوں کو ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا۔ اس صورت حال میں عام لوگوں کے لئے صحیح سمت اختیار کرنا مشکل تھا۔ ایک طرف صدیوں پرانے جانے پہچانے عقاید اور روایات تھیں اور دوسری طرف اسلام کی نئی روشنی تھی۔ اس دوراہے

پیر بڑے بڑوں کے حوصلے شکست ہو گئے۔ وقت کا تقاضا تھا کہ اس نازک موقعہ پر کوئی رہنما سامنے آئے جو غیب کے دروازے کھول کر مضطرب اور بے قرار دلوں کو سکون بخش دے۔ لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا اور کئی اہلِ دل صوفی، سنت اور مشائخ، قلندر اور پاک نفس اسی زمانے میں سامنے آئے اور وہ اسرار جن سے لوگ حیرت زدہ تھے۔ سمجھ میں آنے لگے۔ ان بزرگوں نے اپنے طرزِ عمل سے لوگوں کے دل جیت لئے اور آویزشوں اور خیالات کی جس جنگ کی آگ سلگ اٹھی تھی اُسے آہستہ آہستہ بجھا دیا۔ اس عہد کی بے چینی کا ذکر کرتے ہوئے بامزئی رقم طراز ہیں:-

"مذاہب کے اس اُبال کے عہد میں مذہب کو سمجھانے کے ایک ایسے طریقہ کار کی ضرورت تھی جو تمام ذاتوں کا احاطہ کر سکے اور دماغ سے زیادہ دل کو متاثر کر سکے۔ کشمیر کی دینی اور فلسفیانہ روایات اس مقام پر بار آور ثابت ہوئیں۔ کئی صوفی اور سنت سامنے آئے جو اپنی تعلیمات اور نفی ذات کی زندگی سے دھرم اور اخلاق کے زندہ پیکر تھے۔ ان لوگوں کی پہلی صف میں عظیم عارفہ للہ ایشوری تھیں جن کو عام طور سے لل دید کہا جاتا ہے"۔ [1]

لل دید چودھویں صدی کے اس انتہائی بحرانی دور میں جب کشمیر میں صدیوں سے استوار ایک نظام حکومت ہچکیاں لے کر دم توڑ رہا تھا اور ایک نئے نظام کے لئے آغوش کھولے ہوئے تھا اور ایک قدیم مذہبی فکر مقابلتاً نئے دینی عقائد کے ساتھ برسرِ پیکار تھی، کشمیر کے افق پر نمودار ہوئیں اور اس بات کے باوصف کہ انہوں نے

---

[1] KOSHUR SAMACHAR (LAL DED NUMBER 1970-71) PAGE 13

اپنی فکری بالیدگی اور باطنی نور کی روشنی سے صحیح سمت کی نشاندہی کی وہ اکثر تاریخوں اور نیم تاریخی تذکروں میں مورخوں کی تساہل پسندی کا نشانہ بن گئی ہیں۔ چنانچہ بعض اہم مورخوں اور تذکرہ نویسوں نے پراسرار خاموشی اختیار کر کے لل دید کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش پیدا کر دی ہے اور ان کے ارد گرد پُراسراریت کا ہالہ بن لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی کے بیشتر گوشے نظروں سے اوجھل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لل دید کا وجود روز روشن کی طرح ایک حقیقت ہے۔ تذکروں اور تاریخوں میں للہ دید کے بارے میں سہو کی وجہ غالباً بقول پروفیسر جے لال کول یہی ہو سکتی ہے کہ یہ کتابیں جدید تقاضوں کے مطابق تواریخیں نہیں ہیں اور صرف بادشاہوں یا سیاسی واقعات کا بیان ہیں۔ چنانچہ جونراج، شری ور، ملک حیدر، پرجابٹ مصنف بہارستان شاہی اور کئی دیگر مورخین نے للہ کا کہیں ذکر نہیں کیا ہے البتہ بعد کے مورخین میں سے خواجہ اعظم دیدہ مری، حسن کھویہامی، بابا داؤد مشکواتی وغیرہ نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس عظیم عارفہ کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔

للہ ایشوری کی تاریخ پیدائش خاصی متنازعہ فیہ رہی ہے۔ مورخ حسن نے اگرچہ اپنی تاریخ میں للہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور کئی متنازعہ فیہ مسائل کے لئے جگہ پیدا کی ہے۔ مگر وہ بھی اس کی تاریخ پیدائش کا ذکر حتمی طور پر مورخانہ صداقت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے ہیں چنانچہ لکھتے ہیں:۔

> "ساتویں صدی ہجری میں سیمپور گاؤں کے ایک پنڈت
> گھرانے میں پیدا ہوئی۔ یوم ولادت اور تاریخ وفات
> کا درست پتہ نہیں۔" [۱]

---

[۱] تاریخ حسن (تذکرہ اولیائے کشمیر) تیسرا حصہ ص ۲۴۴

آر.کے. پارمو اپنی کتاب میں للہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی تاریخ ولادت کے بارے میں بڑا ہی مبہم انداز اختیار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"وہ (للہ) پاندریٹھن میں پیدا ہوئی۔ اس کی ولادت
اور وفات کی صحیح تاریخوں کا تعین کرنا مشکل ہے۔
جب وہ سید علی ہمدانیؒ (۱۳۸۰-۱۳۸۴) سے ملیں
تو اس وقت وہ ایک بالغ خاتون ہوں گی"۔ ۱؎

البتہ صوفی نے اپنی تاریخ کشمیر میں للہ کی تاریخ پیدائش قطعیت کے ساتھ یوں لکھی ہے :-

"للہ عارفہ ۷۳۵ھ بمطابق ۱۳۳۵ء میں اودیان
دیو کے عہد میں پیدا ہوئیں"۔ ۲؎

چنانچہ اپنی دلیل کے جواز میں وہ عبدالوہاب شائق کا ایک فارسی شعر سند کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ شعر یوں ہے :-

فزوں بود بر ہفت صد سی و پنج
ز ویرانہ شد پدیدار گنج

پریم ناتھ بزاز، صوفی کے ہم خیال نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق بھی للہ الیشوری کی تاریخ پیدائش ۱۳۳۵ء ہے ان کا بیان ملاحظہ ہو :

"للہ ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوئیں جبکہ اودیان دیو تخت نشین تھا
اور ہندوراج بڑے کرب سے بستر مرگ پر دم توڑ رہا تھا"۔ ۳؎

۱؎ R.K.PARMU:- HISTORY OF MUSLIM RULE IN KASHMIR PAGE 107.

۲؎ G.M.D.SUFI :- KASHIR VOL II PAGE 385

۳؎ P.N. BAZAZ [illegible]

خواجہ اعظم دیدہ مری نے اپنی تاریخ اعظمی میں للہ کی پیدائش کا ذکر تو کیا ہے لیکن صحیح تاریخ بتانے سے گریز کیا ہے۔ وہ صرف یہ بتا سکے ہیں کہ للہ کا زمانہ سلطان شہاب الدین کا زمانہ تھا جس کا دورِ حکومت ۱۳۵۴ء سے ۱۳۷۳ء تک پھیلا ہوا ہے۔ للہ ایشوری کے ساتھ سلطان کی شہزادگی کے زمانے کی ایک ملاقات کا ذکر یوں کیا گیا ہے:۔

"سلطان شہاب الدین پسر سلطان علاؤالدین بعد
فوت بزرگوار بہ مشورہ امرائی نامدار بر تخت نشست
کہ پیش از جلوس در زمانِ پدر عالی مقدار طرف جنگلے
بہ تقریب شکار رفتہ بود و از مجذوبہ کاملہ دو پیالہ شیر
خوردہ و بشارتِ سلطنت یافتہ بود گویند کہ آں
مجذوبہ للہ عارفہ است" [1]

بامزئی کا بیان اعظم دیدہ مری کے قریب معلوم ہوتا ہے۔ وہ دوسرے مورخین سے اختلاف کرتے ہوئے للہ دید کی پیدائش کا زمانہ سلطان علاؤالدین کے دورِ حکومت کا زمانہ قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ لکھتے ہیں:

"وہ (للہ) تقریباً مسیح کی چودھویں صدی کے وسط
میں سلطان علاؤالدین کے عہد حکومت میں پیدا ہوئی" [2]

یہ بات قابلِ غور ہے کہ سلطان علاؤالدین کا زمانۂ حکومت ۱۳۴۳ء سے ۱۳۵۴ء ر رہا ہے۔ پروفیسر جے لال کول نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اپنے ایک مضمون میں انہوں نے بھی ۱۳۳۵ء [3] کو للہ کی پیدائش کا سال بتایا ہے، لیکن ایک

---

[1] ہمارا ادب مشاہیر نمبر (۱۹۷۶-۱۹۷۷) ص ۱۶

[2] P.N.K. BAMZAI:- A HISTORY OF KASHMIR - 359

[3] J.L. KAUL:- STUDIES IN KASHMIRI P. 177

دوسری جگہ وہ خود اپنی تردید کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

"للہ دید کی تاریخ پیدائش ۱۳۱۷ء اور ۱۳۲۰ء کے
درمیان کسی بھی وقت تسلیم کی جا سکتی ہے۔ ہو سکتا
ہے کہ اس سے قبل بھی ہو لیکن کسی بھی طرح ۱۳۲۰ء
کے بعد نہیں ہے" ۔ ؎۱

اس افراط و تفریط کے عالم میں للہ دید کی تاریخ پیدائش کے بارے میں قطعیت کے ساتھ فیصلہ کرنا ناممکن ہے۔ یہ بات البتہ یقینی ہے کہ للہ نے چودھویں صدی کے دوسرے یا تیسرے دہے میں جنم لیا۔ اور یہ زمانہ راجہ اودین دیو یا اس کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ ہندو راج نزع کی حالت میں تھا۔ نئی صدی کے آغاز سے کئی انقلابات رونما ہوئے جن کے دوررس نتائج نکلے اور جن سے کشمیر کی ساری تاریخ بدل گئی۔ راجہ سہدیو (۱۳۰۱ - ۱۳۲۰) وسط ایشیا کے ایک قبائلی سردار کے حملے سے پسپا ہو کر ملک سے بھاگ کھڑا ہوا۔ رینچن (۱۳۲۰ - ۱۳۲۳) اور دین دیو (۱۳۲۳ - ۱۳۳۸) اور کوٹا رانی (۱۳۳۸-۳۹) کی حکومتیں برائے نام ثابت ہوئیں اور ہندو راج کے اثرات آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے۔ اس موقعے پر شاہ میر اپنی پوری طاقت اور حکمت عملی کے ساتھ نمودار ہوا اور اس نے کوٹا رانی کو تخت سے ہٹا کر حکومت کی عنان خود سنبھالی اور باقاعدہ طور پر اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔ للہ ایشوری کی پیدائش کا کم و بیش یہی زمانہ ہے۔ اس کے بعد وہ کافی طویل عمر تک زندہ رہیں اور کئی مسلمان حکمرانوں کا زمانہ دیکھا۔

للہ موجودہ سرینگر سے کوئی چار میل دور پاندریٹھن میں پیدا ہوئیں جو

؎۱ لل دید ص ۲

مہاراجہ اشوک نے راجدھانی کے طور پر آباد کیا تھا اور ایک عرصہ تک پرانادھشٹھان (پرانا شہر) کے نام سے مشہور تھا۔ ان کے والد کا نام ٹرنزرہ بٹ تھا جو ایک متمول کشمیری پنڈت زمیندار تھے۔ کئی مورخوں کا خیال ہے کہ وہ پانپور کے نزدیک سیم پور نام کے گاؤں کے رہنے والے تھے۔ للہ نے اپنی خاندانی روایات کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے کُل گورو سدھ سری کنٹھ المعروف سدھ مول ایک نامی گرامی عالم اور فاضل تھے اور انہیں ترکہ فلسفے پر عبور حاصل تھا۔ وہ خود بھی ایک یوگی اور پاک نفس بزرگ تھے۔ للہ نے روحانی اور دینی تعلیم کے ابتدائی اسباق ان ہی سے حاصل کئے۔ اپنے گورو کی تعلیمات کو للہ نے گہرے انہماک سے نہ صرف سمجھ لیا بلکہ نہایت ہی سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ جذب بھی کر لیا۔ بعد کے برسوں میں جب للہ کا شعور پختہ ہوا اور ان کو گیان و عرفان کی بیش بہا دولت حاصل ہوئی تو وہ اپنے چیلے کے کشف و کمال اور بصیرت اور آگہی کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے۔

للہ کی شادی کم سنی میں ہوئی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ابھی بارہ سال کی بھی نہ ہوئی تھیں کہ ان کا ہاتھ پدمان پور (موجودہ پانپور) کے ایک برہمن زادے کے ہاتھ میں دیا گیا۔ یہاں للہ کا نام پدماوتی رکھا گیا۔ پدماوتی کے لئے زندگی کا یہ موڑ نہایت اہم ثابت ہوا۔ بچپن کے الہڑپن کا زمانہ بیت چکا تھا اور ازدواجی بندھنوں کی ذمہ داریاں نہایت ہی کم سنی میں شروع ہوئیں۔ سسرال ایسا ملا جہاں دور دور تک امن و سکون کا گذر بھی نہ تھا۔ کنوارپن میں جو شاداب اور پُر سکون بچپن دیکھا تھا اس کی ساری لطافت اس کا سارا حسن اور اس کی ساری رعنائی سسرال کے تپتے ہوئے ریگزار میں خاکستر ہوئی۔ اجنبی ماحول، تندمزاج اور ظالم ساس کی سفاکی لاپرواہ اور کٹھور شوہر کی بے اعتنائی اور سب سے بڑھ کر قدامت پرستی کے حصار

قدم قدم پر احتساب، پل پل ٹھوکریں، بات بات پر طعنوں کی کیلی فضا تھی کہ عصمت شعاری پر مشکوک سرگوشیاں۔ کمسن تنہائیوں کی عاشق، باطن کے بے نام درد کی ہلکی ہلکی ٹیسوں سے بے چین پدماوتی۔ اس مجبور فضا میں گھٹن محسوس کرنے لگیں لیکن بچپن سے جو صبر، ضبط اور ایثار کا جہیز وہ ساتھ لے آئی تھیں اس کے سہارے سسرال کی اس تند آندھی کا مقابلہ کرنے لگیں۔ ساس کے سفاک رویے اور شوہر کی بے مروتی نے گداختگی میں اضافہ کیا۔ وہ نہایت خاموشی سے اس غیر انسانی سلوک کو برداشت کرتی رہیں۔ دن بھر کی گرہستی کے کام کے بعد بیٹھے کے لالے پڑنے لگے۔ بھات کی تھالی میں پتھر کے ڈھیلے ملے لیکن زبان نے اُف بھی نہ کی۔ ایسی صورت حال میں جب سہیلیوں نے حال پوچھا تو بے اختیار صرف اتنا کہہ سکی سہ

ہۆنٛڈ مارِ ی تن کٕٹھ مارِی تن کٕٹھ

لَلہِ نٕلہِ وٕٹھ ژٕلہِ نہٕ زانہہ

(بھیڑ ذبح ہو یا مینڈھا، للہ کے مقدر میں پتھر کا ڈھیلا ہی ہے)

روایت میں لپٹی ہوئی بے شمار کہانیاں للہ کی زندگی کے ساتھ وابستہ ہیں کہا جاتا ہے کہ وہ روز صبح سویرے دریا سے پانی لے آتی تھیں اور اسی بہانے تھوڑی دیر کے لئے مندر میں چلی جاتی تھیں اور پوجا سے فارغ ہو کر پانی کا بھرا ہوا مٹکا دریا سے لے آتی تھیں۔ ایک روز بپھرا ہوا شوہر راستے میں ملا اور بہانہ تراش کر مٹکے کو چھڑی کی ضرب سے توڑ دیا۔ مٹکا ٹوٹ گیا لیکن پانی پدماوتی کے کندھے پر جما رہا جو چند ایک قطرے زمین پر گر پڑے ان میں سے ایک چشمہ پھوٹا جو آج تک لل تراگ کے نام سے مشہور ہے اور جس میں ابھی حالیہ برسوں تک پانی موجود تھا۔ اس واقعے سے نہ صرف للہ کا شوہر مبہوت رہ گیا بلکہ اُن کی پُراسرار شخصیت کا جادو لوگوں پر نقش ہو گیا۔ پدماوتی کے صبر کے سب بندھ ٹوٹ گئے۔ اندر کی آگ بھڑک اُٹھی۔

ذوقِ جنون کو ہوا لگ گئی اور اپنے ان دیکھے پیا کے بِرہ نے مستی اور فقر کے لیئے راستہ صاف کیا۔ پدماوتی نے دامن چاک کیا اور حق و صداقت کے سرچشموں کی تلاش اپنا مسلک بنالیا اور یہیں سے ان کی زندگی کا اصلی سفر شروع ہوا۔ اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال کے لگ بھگ تھی۔ اس واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پریم ناتھ بزاز رقم طراز ہیں:-

"اس کی ازدواجی زندگی کے زیادہ سال نہیں گزرے تھے جب للہ نے اپنے رشتوں، ناطوں کو ترک کر کے انسانی سبھنے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ وہ نوجوان تھی۔ غالباً اس کی عمر ۲۵ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ جب اُس نے گھریلو بندھنوں کو توڑ کر حق کی تلاش شروع کی۔" ۱

للہ اپنے جس معبود کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر دیوانہ وار گھومنے لگیں اس کی ہر ادا اُن کو بھا گئی تھی اور اس کے پیار کی کسک کو مدتوں سے اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں دستک دیتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ بچپن میں جو چنگاری بھڑک اٹھی تھی وہ اب ایک شعلہ بن چکی تھی من مندر کی اس جوت کا احساس انہوں نے ایک بار اس طرح دلایا:-

آیس تہ سیوٗدُے گژھہ تہ سیوٗدُے
سیدِس ہوٗل مےٚ کرہم کیشاہ
ہٕتَس اَسیس آگرے ویزی
ویدِس تہ دیشِدِس کرہم کیشاہ

---

۱ P.N. BAZAZ : DAUGHTERS OF VITASTA PAGE 127

(میں راہِ راست سے چلی آئی اور اسی طرح بھی چلی جاؤں گی
وہ مجھے ازل سے جانتا ہے مجھ جانی پہچانی کو کوئی کیا کرے)

لیکن پھر ایسے میں کبھی کبھی اُسے اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا رہا۔ اس بات کے باوجود کہ معبودِ حقیقی کا پیار اس کی نس نس میں رچا ہوا ہے اور وہ اس کے پیار کی دیوانی ہے لیکن اپنے میں اس قدر سکت نہیں پاتی کہ اس من موہنی صورت کا سامنا کرے۔ پیا کے گھر کا سفر طویل ہے۔ جیب خالی ہے۔ بحرِ بیکراں سامنے پڑا ہے۔ اس تند اور اتھاہ سمندر کو کیسے پار کرے اور اپنے پیا سے جا ملے۔ اعتماد کی اس کمی کا احساس للہ یوں دلاتی ہے۔

آیس وَتے گییس نہ وَتے
سُمن سوتھِ مَنٛزٕ لوٗسم دوہ
چَنٛدس وُچھم تہٕ ہار نہٕ اَتے
نادِ تارس دِمہٕ کیاہ بوہ

(سیدھے راستے سے چلی آئی۔ لیکن واپسی کا راستہ بھول گئی، ندی کے کنارے تک آتے آتے، شام ڈھل گئی ۔۔۔ جیب خالی ہے ماجھی کو کیا دوں کہ پیا پار لگا دے)

دنیاوی بندھنوں سے آزاد ہو کر للہ اپنے پیا کی تلاش میں سالہا سال تک سرگرداں رہی۔ برہ کی آگ نے اسے مجذوب بنا دیا۔ وہ غاروں، بیابانوں، جنگلوں اور بستیوں میں ایک آوارہ گرد کی طرح گھومنے لگی۔ ظاہری وجود سے بے نیاز نہ تن ڈھانپنے کا غم اور نہ پیٹ پالنے کی پریشانی، ننگ دھڑنگ، دیوانی، دفورِ جذبات سے لہلہاتی گاتی اور ناچتی رہتی، پیٹ کا نچلا حصہ آہستہ آہستہ نیچے سرک گیا اور پوشیدہ اعضاء پر ستر کا کام کرنے لگا۔

اسی مستی کے عالم میں جب لوگ اسے دیوانی کہتے تھے وہ فرزانگی کی اعلیٰ منزل میں آگئی تھیں اور اپنے مخصوص آہنگ کے ساتھ اپنی روح کا درد اور اپنی تلاش کی کسک "واکھیوں" کی صورت میں ڈھالنے لگیں۔ یہی "واکھ" آج کشمیری شاعری کا سرِ آغاز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ ان کے پسِ پشت ایک ایسی شخصیت کا بھرپور احساس سامنے آجاتا ہے جس پر گیان و عرفان کے خزانے وا چکے ہوں۔ جس میں بصیرت اور آگہی کی نہ بجھنے والی جیوت جھلملاتی ہے۔ للہ نے اپنے گورو سدھ سری کنٹھ سے جو گورو اپدیش پایا تھا۔ اس کی روشنی ہی میں للہ نے اپنے لئے ایک نیا راستہ تراش لیا۔ اپنی دیوانگی اور مستی کا راز اپنے ایک واکھ میں یوں بیان کیا ہے۔

گورن دوپنم کُنُے وَژُن
نیبرٖ دوپنم اَنٛدر اَژُن
سُے ہا مالہِ گوم واکھ تہٕ وَژُن
توے ہیوت مے نَنٛگے نَژُن

(میرے گورو نے مجھے اُپدیش دیا۔ کہا باہر کی دنیا سے من کی دنیا میں چلی آؤ۔ اسی اپدیش نے میری کایا پلٹ دی اور میں عریاں ہوکر ناچنے لگی)۔

للہ نے اپنے گیان و عرفان کی آگہی سے پہلے سدھ سری کنٹھ کے علاوہ کئی برہمن عالموں سے عارفانہ مناظرے کئے۔ تلاشِ حق اور ذوقِ جستجو کو آگہی کی بھٹی میں تپاکر کندن بنادیا۔ اپنے نفس کی پاکیزگی اور تیاگ کی صداقت سے عرفان کی ارفع منزلیں حاصل کرلیں۔ حتیٰ کہ اپنے گورو سے جو شیومت کے فلسفے کا زبردست عالم تھا۔ کئی لحاظ سے آگے بڑھ گئی اور کئی مقامات ایسے بھی آئے جب گورو کو اپنے مرشد کے سامنے لاجواب ہونا پڑا۔ اسی زمانے میں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا للہ کی ملاقات کما

مسلمان عالموں، فاضلوں اور مشائخین کے ساتھ ہوئی جن میں سید جلال الدین بخاریؒ،
سید حسین سمنانیؒ، سید میر علی ہمدانیؒ جیسی برگزیدہ شخصیتوں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔
ان سے عارفانہ باتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کے سلسلے میں کئی روایتیں بیان کی گئی ہیں جن کا
یہاں محل نہیں ہے۔ لیکن یہ بات تسلیم کرنا ہوگی کہ ان ملاقاتوں کے دوران بہت سی
باتوں کا ردّ و قبول ہوا۔ للہ نے بار بار اپنے واکھوں میں اپنے مسلک کی وضاحت کی
ہے۔ انہیں نہ اندھ وشواس پر یقین تھا نہ بت پرستی اور مورتی پوجا پر۔ وہ تہواروں
اور بے معنی رسم و رواج کے خلاف تھیں۔ ان کا سب سے بڑا مسلک شِو یعنی خدا کی
تلاش تھی اور اس کے بعد اس کی ذات میں مدغم ہونے کی تڑپ۔ وہ اس دنیا سے
نکل کر نجات حاصل کرنا چاہتی تھیں۔ وہ معرفت کی اس منزل پر پہنچ چکی تھیں
جہاں ہندو اور مسلمان، رنگ اور نسل، ذات اور خاندان کا کوئی بھید بھاؤ نہیں۔
سب سے بڑی دولت اپنے آپ کو شناخت کرنا ہے اور اسی سے شِو (الشور) کو
پایا جاسکتا ہے۔ اسی لئے کہتی ہیں :-

شِو چھُے تھَلِہ تھَلِہ روزان
مو زان ہیٛوند تہٕ مسلمان
ترُکے چھکھ تہٕ پنہٕ نئے پان زان
اَدِ چھُے صاحبس سیتی زٲنی زان

(شِو (اللہ) ہر جگہ موجود ہے۔ ہندو اور مسلمان کے بھید بھاؤ
سے پرہیز کرو۔ اگر ذہن رسا ہے تو اپنے آپ کو پہچان یہی
الشور کی شناخت ہوگی)

للہ نے اپنے روحانی تجربوں کے اظہار کے لئے نظم کا میڈیم استعمال کیا۔ یہ
میڈیم ان کے واکھ ہیں اور ان سے ہی کشمیری زبان کی شاعری کا صحیح معنوں میں

آغاز ہوتا ہے۔ للہ کی روحانی عظمت سے قطع نظر جب ہم ان کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک عظیم شاعرہ ہیں۔ ان کے سامنے کوئی روایتی تجربہ یا نمونہ بھی نہیں لیکن پھر بھی وہ اپنی بات کہنے اور منوانے کا سلیقہ رکھتی ہیں۔ للہ کی زبان اس وقت کی عام کشمیری زبان ہے۔ اس میں صداقت اور حسنِ بیان کی دلیل ہے جبھی ان کے واکھ زبان زدِ عام ہیں۔ للہ نئے نئے استعاروں سے خوبصورت پیکر تراش لیتی ہیں اور ان پیکروں سے معنی کی پرتیں کھل جاتی ہیں۔ یہ بلیغ اور بامعانی واکھ زندگی کی کتنی ہی مشکلوں کے لئے سہولیت کے دروازے کھول دیتے ہیں اور توہمات اور تعصبات کے گھور اندھیروں میں کھوئے ہوئے انسانوں کو روشن مارگ کی سمت بتلاتے ہیں۔ للہ ترکہ فلسفے کی رازداں ہیں۔ ان کے نزدیک اللہ اور ایشور ایک ہیں۔ اس لئے وہ کٹر برہمنیت اور کٹر ملائیت کے تانے بانے کو کاٹ کر من کی دنیا میں سراغ زندگی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ پوجا پاٹھ، دیر حرم اور مندر و خانقاہ تو صرف ظاہری مذہب کی علامتیں ہیں۔ اس سے گیان اور آگہی کی منزلیں شاید ہی مل سکیں۔ اصلی گیان تو باطن کا نور ہے۔ خودی کی شناخت ہے جہاں سے ازلی نور میں جذب ہونے کی راہ نظر آتی ہے۔ کہتی ہیں۔

گگن ژٔے، بھوتل ژٔے
ژٔے چھکھ دِن پون تہٕ راتھ
ارگ ژنٛدن پوش پوٚنی ژٔے
ژٔے چھکھ سورے لاگہ کیاہ تھ

(میرے معبود! تم ہی آکاش ہو اور تم ہی پرتھوی ہو۔ تم ہی دن اور تم ہی رات ہو۔ تم ہی چندن اور پھول اور پانی ہو تم ہی سب کچھ ہو، میں تمہاری پوجا میں کیا چڑھادوں۔)

للہ ایشوری نے کسی مت کی بنیاد نہیں ڈالی۔ ان کا کوئی پیروکار تھا نہ چیلوں کی کوئی ٹولی۔ لیکن انہوں نے جس فلسفے اور پیغام کو لوگوں تک پہنچا دیا۔ اس کی جڑیں دور دور تک پھیل گئیں۔ للہ کشمیر کی ادبی تاریخ میں ایک پیش رو کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے اپنی روحانی حیثیت سے قطع نظر ان کی ادبی حیثیت بھی ہمیشہ تابندہ رہے گی۔

للہ نے طویل عمر پائی۔ ان کی پیدائش ہی کی طرح ان کا انتقال بھی مورخین میں اختلافی مسلہ رہا ہے۔ صوفی کا خیال ہے کہ للہ نے آخری عمر میں اسلام قبول کیا تھا[1] ان کے انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"للہ کافی بڑھاپے میں زیج بہاڑہ میں وفات پاگئیں جو سرینگر کے جنوب مشرق میں ۲۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ جامع مسجد میں جنوبی مشرقی کونے پر آج بھی اس کے مرازی نشاندہی کی جاتی ہے"[2]

لیکن للہ کے اسلام قبول کرنے کی سند کسی بھی تاریخی یا نیم تاریخی دستاویز میں نہیں ملتی۔ مورخ حسن للہ کی وفات ان لفظوں میں بیان کرتے ہیں:۔

"مورخوں میں سے کوئی اس کی وفات کا قائل نہیں۔ مشہور ہے ایک دن زیج بہاڑہ کی جامع مسجد کی دیوار کے نیچے بیٹھی تھی اور اچانک آگ کے شعلے کی طرح چمک اٹھی اور یہ شعلہ فضا میں اوپر جاکر نظر سے غائب ہوگیا۔ اس کے بعد للہ عارفہ کو کسی

---

[1] SUFI : KASHIR VOL II PAGE 385
[2] SUFI : KASHIR VOL II PAGE 385

نے نہیں دیکھا"[1]

آزاد نے اپنی کتاب "کشمیری زبان اور شاعری" میں محمدالدین فوق کے حوالے سے اس سلسلہ میں یوں لکھا ہے:۔

"انگریز مفسر اس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ جب اس کی روح اس کے قفس عنصری سے نکلی تو وہ ایک شعلہ کی طرح بھڑکی اور ہوا کی طرح جسم سے نکل کر غائب ہو گئی۔ یہ واقعہ بیجبہاڑہ میں پیش آیا۔ لیکن اس کا جسم کہاں گیا اس کے متعلق انگریز مفسر بھی خاموش ہے۔"[2]

صوفی کی کتاب میں جس مقبرے کا ذکر آیا ہے۔ انگریز مفسر کے یہاں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ دوسرے مورخین بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔ اس کی وفات کا ذکر بھی روایات میں لپٹا ہوا ملتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ لل دید ایک بڑے مٹی کے برتن میں سما گئیں اور دوسرا برتن اپنے سر پر رکھا اس کے بعد دو برتنوں کے درمیان اپنے آپ کو چھپا لیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب برتن ہٹایا گیا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس طرح سے للہ دید اپنے معبود کے ساتھ جا ملیں۔ پروفیسر جے لال کول لکھتے ہیں:۔

"للہ دید اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑے بغیر سورگباش ہو گئیں۔ حیرانی کی بات ہے کہ ان کی آخری آرامگاہ پر نہ کوئی سمادھی تعمیر ہوئی ہے اور نہ کوئی مقبرہ۔"

---

[1] تاریخ حسن (تذکرۂ اولیائے کشمیر) تیسرا حصہ۔ ص ۳۴۹

[2] کشمیری زبان اور شاعری جلد دوم ص ۱۲۵

پروفیسر موصوف نے سورگباش ہونے کے وقت للہ دید کی عمر لگ بھگ ۷۱ برس کی بتائی ہے اور سن وفات ۱۳۸۸ اور ۱۳۹۹ کا کوئی درمیانی عرصہ بیان کرتے ہیں۔ للہ دید کی قد آور شخصیت کے ارد گرد پر اسراریت کا جو ہالہ کھینچ لیا گیا ہے۔ اس سے اس کی حقیقت افسانویت میں ڈھل گئی ہے۔ مگر حق بات تو یہ ہے کہ للہ ایک حقیقت ہے، زندہ اور تابندہ اور کشمیر کو ان کی ذات بابرکات پر ہمیشہ ناز رہے گا۔

پیر پنڈت پادشاہ

جھر جھر کرتے ہوئے جھرنوں، سفید برف سے لپکتے ہوئے پربتوں اور اونچے پیڑوں سے لدے ہوئے سنسان جنگلوں کی یہ دنیا سالہا سال سے اہلِ نظر کو دعوت نظارہ دیتی رہی ہے۔ لیکن قدرت کے روپہلے سایوں میں جھولتی ہوئی اس سدابہار سہاگن نے روحانیت اور معرفتِ حق میں ڈھلے ڈھلائے کتنے لال جنے ہیں جن کے گیان اور عرفان نے ایک دنیا کو موہیت کر لیا ہے۔ پنڈت رلیشہ پیر، پیر پنڈت پادشاہ اسی برادری سے تعلق رکھتے ہیں، جس کی فہرست میں للہ دید، شیخ العالم، روپہ بھوانی، مرزا کاک، جیون صاحب، میناصاحب اور ایسے ہی بے شمار لوگ شامل ہیں۔ پنڈت پیر آج سے کوئی چار سو سال قبل اپنے روحانی کمال اپنے کشف و کرامات اور اپنی زبردست تپسیا کے جوہر دکھا چکے ہیں اور آج تک برابر عقیدت مندوں کا سلسلہ بڑھتا چلا آرہا ہے۔ بہت پہلے اردو کے مشہور انشاپرداز اور شاعر پنڈت رتن ناتھ سرشار

نے فخر سے کہا تھا ؎

ہم لوگ برہمنانِ کشمیر اولاد حضور شاہ ریشہ پیر
بدلیں عیسائیوں کا سا بھیس اور جا کے رہیں ملیکش کے دیس[۱]

پیر پنڈت کی ذاتِ اقدس کے ساتھ والہانہ وابستگی نے ایک اور جگہ سرشار سے ایک رباعی کہلوائی تھی ؎

مدّاح جناب ریشہ پیر آتا ہے وصاف شہِ عرش سریر آتا ہے
خورشید کی آنکھ کیوں نہ جھپکے سرشار ہاں ذرّۂ خاک کاشمیر آتا ہے[۲]

سرینگر شہر میں عالی کدل پُل سے ذرا آگے ایک تنگ و تاریک گلی کے اندر دو چناروں کی چھاؤں میں ایک دو منزلہ مکان نظر آتا ہے۔ یہیں پنڈت ریشہ پیر کا حجرا ہوا کرتا تھا اور یہ گلی اب تک اُس درویش باکمال کے نام پر کوچہ ریشہ پیر کے نام سے موسوم ہے۔ آج تقریباً چار سو سال کا عرصہ بیتنے کے باوجود کتنے ہی عقیدت مندوں کے سر روز یہاں جھک جاتے ہیں اور دل ہی دل میں اس مجذوب قلندر کی روح کو سلام کہتے ہیں۔

پنڈت ریشہ پیر ۱۶۳۷ء کو لبا کھہ کرشن بخش کی سرشٹی کو پنڈت گوبند جو خشونام کے ایک متمول کشمیری پنڈت کے ہاں پیدا ہوئے تھے۔ پنڈت گوبند جو کی شادی کسی وجہ سے جوانی کے زمانے میں نہ ہو سکی تھی۔ بڑی تگ و دو کے بعد آخر ہندواڑہ تحصیل کے گشی نام کے گاؤں میں ان کا رشتہ طے ہوا۔ اور وہ محض اپنی دولت کے سہارے ایک غریب گھرانے کی نیک سیرت لڑکی بیاہ لائے۔ کشمیر کے مورخ حسن اپنی تاریخ "تاریخ حسن" (تذکرہ اولیاء کشمیر) میں پنڈت پیر کے والد کے بارے میں مورخانہ تسامح کا

---

[۱] بہار گلشن کشمیر جلد دوئم مولفہ برج کرشن کول بے خبر و جگ موہن رینہ شوق ص ۴۲۹

[۲] بہار گلشن کشمیر جلد دوئم مولفہ برج کرشن کول بے خبر و جگ موہن رینہ شوق ص ۴۴۰

شکار ہوئے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پنڈت گوبند جو گشی کے رہنے والے تھے اور ان کی شادی سرینگر میں ہوئی تھی، چنانچہ لکھتے ہیں :-

"اُن کا باپ پرگنہ اوترکے ایک گاؤں گشی کا باشندہ تھا جو اُن کے پیدا ہونے سے پہلے مرگیا تھا۔ ان کی ماں رنگ ٹینگ کے ایک پنڈت گھرانے کی لڑکی تھی"[1]

یہ بیان حقیقت سے بعید ہے۔ دراصل پنڈت گوبند جو خشو بٹہ یار رنگہ ٹینگ کے رہنے والے تھے، دولتمند تھے اس لئے ڈھلتی عمر کے باوجود گشی (ہندواڑہ) سے دلہن بیاہ لائے۔ لڑکی کی والدہ اپنے داماد کے بڑھاپے کو دیکھ کر دم بخود ہو گئی۔ لیکن اب "ہونی" کو کیسے ٹالا جاسکتا تھا۔ کافی دنوں تک جب بیٹی کے کوئی بچہ نہ ہوا تو ممتا کی ماری ماں آنسو بہاتے ہوئے بھگوان کے کرم کے سامنے جھولی پھیلانے لگی۔ گاؤں کی بغل میں ایک چشمہ تھا۔ جس کے ساتھ آرزو مندوں کی کتنی ہی آرزوئیں وابستہ تھیں[2]۔ پنڈت گوبند جو کی ساس بھی اپنا پرائشچت کرنے کے لئے اس چشمے پر آیا کرتی تھی جہاں آرزو مندوں کی بھیڑ رہتی تھی۔ روایت ہے کہ ایک روز پو پھٹنے سے پہلے بوڑھی ماں چشمے کے کنارے، آنسو کے موتی رولتی ہوئی اپنی بیٹی کے لئے دعا مانگ رہی تھی کہ اچانک غیب سے آواز آئی۔ "اے بوڑھی میا! تمہاری آواز بارگاہِ حق میں سنی گئی ہے۔ تم کل اسی وقت

---

[1] تاریخ حسن حصہ سوم (تذکرہ اولیائے کشمیر) ص ۴۵۰

[2] اس چشمے کے بارے میں الیس۔ این جرانی مصنف "جیون چریتر ریشی پیر" نے لکھا ہے۔

"اس کنڈ کے دیوتا کی نسبت یہ مشہور تھا کہ وہ خوش ہونے پر اپنے بھگتوں کے دامن مراد گوہر مقصود سے بھر دیتا تھا" (جیون چریتر ریشی پیر ص ۲)

یہاں اپنی بیٹی سمیت چلی آنا، تمہیں ایک گل دستہ ملے گا۔ تمہاری بیٹی اسی کو سونگھے تو اس کے من کی مراد پوری ہوگی"۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ دوسری صبح ماں بیٹی سمیت چشمے پر حاضری دینے آئی۔ چشمے سے ایک گلدستہ برآمد ہوا۔ بیٹی نے اسے سونگھ لیا۔ چند روز کے بعد اس پر یہ بات آشکارہ ہوئی کہ وہ پیٹ سے ہے۔ سال بھر کے اندر اس کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جو آئندہ برسوں میں ریشہ پیر کے نام سے مشہور ہوگیا۔ پنڈت پیر کی اس معجزاتی پیدائش کے پیش نظر آج تک پیر گھرانوں میں ان کو "ناگہ بوتھر" یعنی چشمے کا بیٹا کہا جاتا ہے۔

پنڈت پیر کی پیدائش کے بارے میں مورخ حسن سے بھر چوک ہوئی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ریشہ پیر کی پیدائش پنڈت گوبند جو کے انتقال کے بعد ہوئی تھی۔ لکھتے ہیں:۔

"ان کا باپ پرگنہ اودنر کے ایک گاؤں گشی کا باشندہ تھا۔ جو ان کے پیدا ہونے سے پہلے مر گیا تھا"۔ ۱؎

ریشہ پیر کا اپنے والد کے انتقال کے بعد پیدا ہونا کسی اور ماخذ سے معلوم نہیں ہوتا۔ حضرت دلبر کاشمیری اپنی کتاب سالکانِ کشمیر و ہند میں رقمطراز ہیں:۔

"آپ پنڈت گوبند جو خوشوبٹہ بہار کے فرزند تھے۔ بچپن میں ہی پتا کا سایہ اٹھ گیا"۔ ۲؎

ایس، این، چراغی اپنے کتابچے میں لکھتے ہیں:۔

"شادی کے بعد پیر پنڈت کو ایک بھاری صدمہ پیش آیا اور گوبند جو راہیٔ ملکِ بقا ہوئے"۔ ۳؎

۱؎ تاریخ حسن حصہ سوم (تذکرہ اولیائے کشمیر) ص ۴۵۸

۲؎ سالکانِ کشمیر و ہند المعروف سنت مالا حصہ اول و دوم ص ۵۹

۳؎ جیون چرتر ریشہ پیر ص ۷

ان بیانات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پنڈت بیر کے والدان کے بچپن میں رحلت کر چکے تھے۔ اس زمانہ میں رلیشہ پیر رشتۂ ازدواج میں بندھ چکے تھے۔

رلیشہ پیر کی پیدائش کے بارے میں بھی ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ رلیشہ پیر کی والدہ سوپور سے سرینگر کشتی میں سوار ہو کر آ رہی تھیں[۱]۔ کہ سوپور کے مقام پر کشتی میں ہی ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا۔ چونکہ بچے کی پیدائش ناگ رشی کی دعا سے ہوئی تھی اس لیے اس کا نام "رلیشہ" مقرر ہوا۔ سوپور میں ان کی پیدائش کی تصدیق مورخ حسن نے اپنی تاریخ میں یوں کی ہے:-

"سوپور ہی میں کشتی میں رلیشہ پیر کی پیدائش وقوع میں آئی۔"[۲]

کہا جاتا ہے کہ سوپور کے نواحی علاقے میں ایک سادھو ہڑبڑا کر نیند سے جاگ اٹھا اور یہ کہا کہ کہیں پاس ہی ایک سورج چمک اٹھا ہے۔ سادھو پہنچا ہوا بزرگ تھا۔ لوگ باگ تلاش میں دوڑے آخر پتہ چلا کہ ایک کشتی میں ایک بچے نے جنم لیا ہے۔ سادھو وفورِ شوق سے بچے کو دیکھنے گئے اور اسے دیکھ کر بچے کی ماں کو بشارت دی کہ تمہارے گھر میں ایک سورج نے جنم لیا ہے۔

سرینگر میں گوبند جو نے اپنے بیٹے کو نازوں سے پالا۔ زمانے کے رواج کے مطابق پاٹھ شالہ کی تعلیم دلائی۔ مناریشہ پڑھنے لکھنے میں اپنے ہم سبقوں سے بہت آگے تھا۔ بچپن میں ہی بوڑھے باپ نے اکلوتے بیٹے کی شادی رچائی۔ چند سال کے بعد پنڈت گوبند جو سورگباش ہو گئے۔ اور بے چاری ہو سبز قدم ٹھہرائی گئی۔ رلیشہ کے

۱۔ اس زمانے میں رسل و رسائل کے لیے کشتیوں کا استعمال سب سے زیادہ ہوتا تھا۔

۲۔ تذکرہ اولیائے کشمیر ص ۵۸۴

والد جب تک حیات تھے اپنی عاقبت سُدھارنے کے لئے ہر روز ہاری پربت چکر یشور[1] کا طواف کرنے جایا کرتے تھے۔ چھوٹا ریشہ بھی اکثر ان کے ساتھ ہوتا۔ اس طرح بچپن سے ہی ریشہ کے دل میں دھرم اور اعتقاد کی جوت جلی تھی۔ والد کے انتقال کے بعد آہستہ آہستہ دنیا کے معاملات سے ان کی دلچسپی کم ہونے لگی۔ اور آخروی مسائل کی طرف رغبت بڑھنے لگی۔ والد کے انتقال کے بعد یہ ذوق اور بھی بڑھتا گیا۔ ان کے اندر کوئی غیر مرئی طاقت انہیں جھنجھوڑنے لگی۔ ان کا سکون لٹ گیا اور وہ ایک تشنہ لب کی طرح پیروں، فقیروں، سادھوؤں اور سنتوں کی صحبت میں ڈھونڈتے ہوئے نظر آئے۔ کبھی دور اور کبھی نزدیک کے مقدس مقامات کی سیاحت کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ ان کی حالت دیوانوں کی سی تھی۔ ماں اپنے بیٹے کی اس حالت سے نالاں رہنے لگی، اس نے بیٹے کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اُسے یہ بتایا کہ وہ ایک کنبے کا سربراہ ہے ایک بیوی کا شوہر ہے اور ایک بیوہ ماں کی آنکھ کا نور ہے لیکن ریشہ، برہ کی اگنی میں جلا ہوا۔ ایک ازلی عاشق بھلا ان باتوں کی کیا پروا کرتا۔ سادھوؤں اور سنتوں کی صحبت میں جب سکون نہ ملا تو کٹھن تپسیا شروع کر دی۔ وہ دیوی شارکا کے بڑے بھگت تھے۔ اُن ہی کی اپاسنا سے من کو شانت کرنے لگے۔

ایس۔ این۔ چراغی لکھتے ہیں:۔

> "اس کے بعد پنڈت اپنا سارا وقت ہاری پربت میں دیوی کے چرنوں میں گزارنے لگے۔ ان کی

---

[1] ہاری پربت صدیوں سے کشمیری پنڈتوں کا مقدس مقام رہا ہے۔ اس پہاڑ کے چاروں طرف جگہ جگہ ہندوؤں کے استھاپن اور مندر ہیں۔ اس لئے اس پہاڑی کے گرد پنڈت لوگ طواف (پرکرما) کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہیں۔

والدہ نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ وہ دنیاوی کاروبار
کو اپنائے لیکن روحانیت کے سمندر میں ڈوبے ہوئے
پیر پنڈت پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ [1]

ماں نے انہیں کسی طرح اپنے میکے گشی بھجوا دیا۔ وہاں تیاگ اور تپسیا کے راستے سے ہٹانے کے لئے ان پر کڑی نگرانی ہونے لگی لیکن وہاں سے بھاگ نکلے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے تنگ آکر ایک دن شراپ دیا تھا۔

گشی شے ربتھ پشی

(گشی والوں کو صرف چھ ماہ کے لئے اناج ملے)

اور عرصہ دراز تک اہل گشی کو زمین صرف اتنا اناج دینے لگیں جو سال بھر کے بجائے صرف چھ ماہ کی کفالت کرتا سرینگر آکر انہوں نے چالیس دن تک گھٹنوں کے بل چکرلیشور ہاری پربت کے گرد طواف کیا۔ چالیسویں دن دیوی نے بشارت دی کہ ہاری پربت کے پچھواڑے میں جو شخص سب سے پہلے ملے گا وہی ان کا گرو ہے اور وہی ان کے لئے اصلی منزل کی نشاندہی کرے گا۔ روایت ہے کہ یہ شخص مشہور مستانہ جوگی پنڈت کرشنہ کار تھے جنہوں نے تمباکو کے ایک کش کے ذریعے ان پر ازلی حقیقت آشکار کر دی۔ پنڈت کرشنہ کار سے اُن کی مڈبھیڑ ہاری پربت کے پچھواڑے میں ہی ہوئی لیکن ریشہ پیر نے اس مست جوگی سے یہاں کچھ کہا نہ اُن سے کوئی بات سنی۔ جب وہ گھر لوٹے تو ماں کی زبانی معلوم ہوا کہ پنڈت کرشنہ کار اُن سے پہلے آچکے تھے اور اُن کے لئے سلگتا ہوا حقہ چھوڑ گئے ہیں۔ بیٹے نے صرف دو کش کھینچے کہ وہ کسی اور عالم میں پہنچ گئے۔ رام چندر در لکھتے ہیں :-

---

[1] جیون چرتر ریشہ پیر، ص ۷

"دوسرا کش کھینچا تو معرفت کی چنگاری ان کے من
میں بھڑک اٹھی اور منور ہو گئے"۔ ؎۱

ایس۔ این۔ چراغی نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے۔

"پاس ہی ایک حقہ پڑا تھا اس کے ایک دو کش لگا
کر چلتے بنے پیر صاحب گھر پہنچے۔ حقہ بھر کر تمباکو
پیا۔ تمباکو پینا کیا تھا، آپ کا دل نورِ معرفت سے
بھر گیا"۔ ؎۲

روایت سے قطع نظر اس بات کے تواریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ پنڈت پیر کو بچپن سے ہی عشقِ حقیقی سے مناسبت تھی اور یہ کہ اس منزل کی طرف لے جانے کے لیے انہوں نے پنڈت کرشنہ کلر جیسے پہنچے ہوئے روحانی بزرگ کو اپنا گرو بنا لیا تھا۔ مورخ حسن رقمطراز ہیں:۔

"مادر زاد ولی تھے، بچپن ہی سے جب تپ اور
گیان دھیان کے کاموں میں لگے رہتے تھے، رات
کو جاگتے تھے اور ایشور کا نام جپتے تھے۔ بارہ
برس کی عمر میں ملہ کھاہ سے چلتے تھے۔ کرشنہ کار
کی نظر اس مزار میں ان پر پڑی، نظر کھل گئی۔
سب کچھ سامنے نظر آنے لگا۔ گویا یہ دنیا کیا یہ عالم
بالا سب نظر میں سما گیا"۔ ؎۳

؎۱ ماہنامہ "تعمیر" سرینگر اگست ۱۹۶۰ء ص ۴۹ ؎۲ جیون چرتر رشیہ پیر ص ۱۱
؎۳ تذکرۂ اولیائے کشمیر ص ۵۸۔۴

پی این کے بامزئی اپنی کتاب "اے ہسٹری آف کشمیر" میں لکھتے ہیں:۔

"ریشہ پیر کا بچپن سے ہی مذہبی رجحان تھا انہوں
نے مشہور سادھو پنڈت کرشنہ کار کو اپنا روحانی
گرو پالیا تھا" ؎۱

اپنی حقیقی منزل کی نشاندہی پاکر ریشہ نے اپنا سارا وقت زبردست تپسیا میں صرف کرنا شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دوبارہ چودہ چودہ سال سخت ریاضت میں گزارے دوسرے دور میں کھانا پینا ترک کر دیا۔ صرف دودھ اور پانی کا استعمال کرتے تھے۔ اب وہ مکمل طور تیاگی ہو چکے تھے۔ ان کا جسم انتہائی لاغر ہو گیا اور ہاتھ پاؤں چلنے پھرنے کے قابل نہ رہے۔ ان کے اہل خاندان کا کہنا ہے کہ کڑاکے کی سردی میں ساڑھے چودہ مٹکے سرد پانی اپنے جسم پر ڈال دیا کرتے تھے اور جلتی ہوئی گرمیوں میں ساڑھے چودہ جلتے ہوئے توت کے انگاروں سے بھری ہوئی کانگڑیوں کی آگ اپنے جسم پر ڈال کر آگ سے نہایا کرتے تھے ؎۲ اس زبردست اذیت کوشی سے ان کے جسم پر بڑے بڑے گھاؤ پیدا ہوئے اور کیڑوں نے ان زخموں میں بسیرا کیا لیکن اس مجذوب کامل کو اس کی کیا پرواہ تھی۔ جن لوگوں کو من کی دنیا حاصل ہو انہیں تن کی اذیت سے کیا مطلب؟ ان کے عقیدت مندوں اور چیلوں نے ان کے زخموں کو صاف کرنا چاہا لیکن پیر پنڈت اسی حال میں مطمئن رہے۔

ریشہ کو اپنے فقر، قلندری اور صاحب کرامات ہونے کی وجہ سے اسی زمانے میں اسلامی اثرات کے تحت "پیر" کہا جانے لگا۔ دلبر کاشمیری اس سلسلے میں یوں

؎۱ BAMZAI: HISTORY OF KASHMIR PAGE 544

؎۲ توت کا یہ درخت اُن کے آستانے کے پچھواڑے میں آج تک کھڑا ہے اور اسے پیر خاندان کے لوگ "حمام" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

رقمطراز ہیں:

"آپ نے ایسی کٹھن تپسیا کی۔ منش کیا دیوتا بھی ششدر رہ گئے۔ اس کے بعد آپ باکمال عارف تصور ہونے لگے اور کشف و کرامات میں کمال دکھایا۔ جبھی آپ پیر کے نام سے مشہور ہوئے" ؎۱

ان کے عقیدت مند چونکہ ہندو اور مسلمان دونوں فرقوں کے لوگ تھے اور ان کے کشف و کرامات سے لوگوں کی مراد پوری ہوتی تھی اس لئے سب لوگ انہیں "پیر" کہنے لگے۔ پیر پنڈت نے ایسی کرامتیں کیں کہ ایک دنیا عش عش کر اٹھی۔ حسن کا بیان اس سلسلے میں دلچسپی سے خالی نہیں لکھتے ہیں:

"زبان تلوار تھی جو کہتے تھے وہی ہو جاتا تھا بھکاری آن کی آن میں راجہ اور راجہ آن کی آن میں بھکاری ہو جاتا تھا۔ اگر ان کی زبان سے کچھ نکلتا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان' ان کے سخت معتقد تھے" ؎۲

اُس زمانے میں مغل شاہزادے دارا شکوہ (جو اس وقت قتل ہو چکے تھے) کے استاد مُلا آخون شاہ کشمیر میں اقامت پذیر تھے' وہ ایک اعلیٰ پایہ کے عالم تھے ریشہ پیر کے ساتھ اُن کے کئی بار مناظرے ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار مُلا آخون شاہ نے پیر پنڈت کو کھانے پر مدعو کیا۔ پنڈت پیر نے کہا کہ وہ اپنے ساڑھے بارہ سو

؎۱ سالکان کشمیر و ہند المعروف سنت مالا حصہ اول و دوئم ص ۵۹

؎۲ تذکرہ اولیائے کشمیر ص ۵۸۴

چیلوں کے ساتھ اس شرط پر کھانے میں شریک ہوں گے کہ کھانا صاف و پاک ہو اور یہ کہ کسی نے اس کے کسی حصے کو نہ چکھا ہو۔ ملا شاہ نے اس شرط کو قبول کر لیا کھانا بڑے اہتمام اور احتیاط سے پک گیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب کھانا آگیا تو پنڈت پیر نے چلو بھر پانی رکابیوں پر پھینک دیا۔ کھانے کی تمام چیزیں اپنی اصلی ہیئت میں آگئیں۔ مرغ مسلم ککڑوں کڑوں کرتے ہوئے ظاہر ہوئے۔ ایک مرغ ایک ٹانگ سے محروم تھا۔ باقی چیزیں سالم تھیں۔ پتہ چلا باورچی نے مرغ کی ایک ٹانگ چکھ لی تھی۔ روایت میں لپٹے ہوئے اس واقعے سے قطع نظر یہ بات تواریخی شواہد سے مصدقہ بن جاتی ہے کہ پیر صاحب اند ملا آخون شاہ[1] کے تعلقات تھے اور ان کے آپس میں مناظرے بھی ہوئے تھے۔

---

[1] ملا آخون شاہ کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ملا آخون شاہ دراصل ایک زبردست سحر ساز تھے اور جادو کی طاقت سے پنجاب کی ایک حسینہ کو رات کے وقت اپنے پاس اڑا لاتے تھے۔ اس کی شکایت اورنگ زیب سے کی گئی۔ انہوں نے جب کشمیر کے ارباب اختیار سے اس کی پوچھ گچھ کی تو انہیں بتایا گیا اتنا بڑا کمال صرف ریشہ پیر کا ہو سکتا ہے۔ چناں چہ ریشہ پیر کی گرفتاری کے احکامات جاری ہوئے لیکن تواریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ آخون شاہ دارا شکوہ کے استاد، مشہور عالم اور روحانیت میں دخل رکھنے والے بزرگ تھے۔ حتیٰ کہ ریشہ پیر کے ساتھ اُن کے کئی مناظرے ہوئے۔ پنڈت ریشہ پیر بعض اوقات فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چناں چہ ملا آخون کے ساتھ انہوں نے کئی بار عارفانہ گفتگو بھی اشعار میں کی ہے ایک ایسے ہی موقعے پر ملا آخون نے کہا تھا:

امروز شاہ شاہان مہمان شدہ است
جبرئیل با ملایک دربان شدہ است مارا

پیر پنڈت نے جواب میں کہا تھا:

درمذہبِ گدایاں مرسل نبی نہ گنجد
سامانِ بے نوایاں سامان شدہ است مارا

(بہارِ گلشنِ کشمیر جلد دوئم)

بامزی لکھتے ہیں :۔

"ریشہ پیر اپنے درویشانہ مزاج کی بدولت بہت جلد لوگوں کے ہر طبقے میں مقبول ہوئے۔ دارا شکوہ کے استاد ملا آخون شاہ نے اس زمانے میں ہاری پربت پہاڑی کی شمالی ڈھلوان پر اپنی خانقاہ بنائی تھی۔ ان کے ساتھ ریشہ پیر کے کافی مناظرے ہوئے۔"[1]

عمر کے آخری حصے میں مستی نے غلبہ پالیا تھا۔ وہ روحانی نور و سرور سے مخمور رہا کرتے تھے۔ عقیدت مند پالکی میں بٹھا کر ادھر ادھر گھمایا کرتے تھے اور لوگوں سے زر نیاز حاصل کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ریشہ پیر "پادشاہ دو جہاں" کہلائے یہ خبر ہندوستان کے مغل تاجدار شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے کانوں تک پہنچی انہیں بہت غصہ آیا حکم دیا کہ ریشہ پیر کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ حکومت کے کارندے سرکار کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے پیر صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ دوسری صبح پیر صاحب کو ان کے ساتھ جانا تھا۔ روایت ہے کہ رات کو پیر صاحب اپنے کمال سے اورنگ زیب کے پاس پہنچے اور ان سے پوچھا کہ طلبی کس بات کے لئے ہے؟ اورنگ زیب پیر صاحب کے کمال کو دیکھ کر متحیر ہوئے اور انہیں پیر پنڈت پادشاہ ہر دو جہاں مشکل آسان[2] کا لقب دیا اور اُس وقت کے صوبہ دار کشمیر سیف خان کو حکم دیا کہ انہیں دلو سر پرگنہ میں جاگیر دی جائے۔[3] ریشہ پیر کی گرفتاری کے اس واقعے کا ذکر بامزی یوں کرتے ہیں:۔

---

[1] BAMZAI: A HISTORY OF KASHMIR - PAGE 544

[2] تاریخ کشمیر جلد دوئم از محمد دین فوق بحوالہ "تعمیر" سرینگر اگست ۱۹۶۰ء ص ۵۲

[3] "تعمیر" سرینگر اگست ۱۹۶۰ء ص ۵۲

"ریشہ پیر کو اپنے معتقد پادشاہ دو جہاں کہتے تھے
اور اس کے ساتھ داراشکوہ کے استاد کے ساتھ
ریشہ پیر کے تعلقات نے اورنگ زیب کو چونکا
دیا اور خاص طور پر جب کہ اسے ملک کے
دوسرے حصوں میں مذہبی رہنماؤں کی شروع کی
ہوئی بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس لئے
اس نے اپنے گورنر سیف خان کو حکم بھیج دیا کہ ریشہ پیر
کو گرفتار کر دے۔ لیکن ہندو لوگ یہ کہتے ہیں کہ
وہ (ریشہ پیر) اسی رات اورنگ زیب کو خواب
میں ظاہر ہوئے اور مانگ کی کہ شاہی فرمان کو
منسوخ کیا جائے۔ مسلمانوں کی روایت ہے
کہ چند وزرائے نے شہنشاہ کو یقین دلایا کہ ریشہ پیر
کے کوئی سیاسی مقاصد نہیں بلکہ وہ محض ایک
پاک طینت آدمی ہیں ..... شاہنشاہ نے
احکامات منسوخ کئے اور ریشہ پیر نے اپنے
مذہبی مشن کو پُر امن طریقے سے جاری رکھا۔"[۵]

بامزئی کا یہ بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ اورنگ زیب نے تخت پر بیٹھنے کے بعد اپنے دشمنوں کو ٹھکانے لگایا۔ داراشکوہ بھی اُس کے ہاتھوں بچ نہ سکا۔ لہذا داراشکوہ کے قرابت داروں اور اس کے ہمدردوں سے اورنگ زیب کو ہمیشہ خطرہ

---

۵ BAMZAI: A HISTORY OF KASHMIR PAGE 554

لاحق رہا ہوگا۔ اسی طرح سرمد جیسے صوفیوں کے قتل کا آسیب بھی ہمیشہ اس کے لاشعور میں اُسے ڈستا رہا ہوگا۔ ایسی صورت حال میں ریشہ پیر جیسے صوفی اور دارا شکوہ کے استاد مُلا آخون کی ملاقاتوں کو وہ کس طرح سے پسند کر سکتا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ ریشہ پیر کی گرفتاری کے احکامات ہی ہو سکتے ہیں

بامزئی کے بیان سے اس بات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اورنگ زیب نے پنڈت پیر کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ اس سلسلے میں ان کا یہ بیان قابلِ توجہ ہے:۔

"اورنگ زیب اپنے وقت کے مشہور صوفی
سرمد کو پھانسی پر چڑھانے کی مذموم حرکت
پر نادم محسوس ہوتا ہے۔ چناں چہ ۱۶۶۵ء
میں جب اورنگ زیب کشمیر آیا تو ریشہ پیر نے
اُسے یقین دلایا کہ سرمد جیسی عارفانہ روحیں موت
کی پروا نہیں کرتیں اور نہ ہی ان لوگوں کے خلاف
گلہ کرتی ہیں، جو ان کو نقصان پہنچاتی ہیں[۱]"

ذکر ہو چکا ہے کہ ریشہ پیر پالکی میں بیٹھ کر شہر کے کئی حصوں میں گھوما کرتے تھے۔ ان دنوں وہ مجذوبِ کامل تھے وہ ساڑھے چودہ پیسے (اس زمانے کے سکے کے مطابق) لوگوں سے زرِ نیاز حاصل کرتے تھے۔ روایت ہے کہ ایک بار حسبِ معمول اپنے چیلوں کے کاندھوں پر سوار بہوری کدل کے قریب سے گھوم رہے تھے اور ان کے چیلے زرِ نیاز لوگوں سے مانگ رہے تھے کہ کسی شخص نے شرارتاً افیون کی گولی ان کے منہ میں ڈال دی، ایک شیر گوجری نے یہ حال دیکھا کہ پیر صاحب افیون کی گولی پھانک گئے

---

۱ BAMZAI : A HISTORY OF KASHMIR PAGE 554

ہیں۔ دودھ کا گلاس پلادیا۔ روایت ہے کہ میلے میں اسی شام زبردست آگ نمودار ہوئی جس میں تقریباً دو ہزار مکان تلف ہوئے۔ ایک صرف اس شیر گوجری کا مکان بچ گیا۔ یہ واردات کشمیر کی تاریخ میں غالباً سب سے ہولناک آگ کی واردات ہے جس نے ایک پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب آگ کسی طرح بجھنے نہ پائی تو لوگ پنڈت پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی منتیں کیں آخر انہوں نے اپنا ایک کھڑاؤں آگ میں ڈال دینے کی اجازت دیدی۔ آگ بجھ گئی۔ اس روایت سے قطع نظر تواریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اسی زمانے کے آس پاس ۱۶۷۵ میں آگ کی ایک زبردست واردات اسی علاقے میں رونما ہوئی جس میں تقریباً دو ہزار مکان جل کر راکھ ہوگئے۔

پیر پنڈت اپنی کرامات اور روحانی کمالات کے لئے سارے کشمیر میں مشہور ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی ہم عصر مشہور عارفہ الک صاحبہ روپہ بھوانی کو پیر صاحب کی یہ سب باتیں پسند نہیں تھیں۔ وہ پنڈت پیر کے روحانی کمال کی قائل تھیں لیکن اس کے ساتھ وہ جو اپنی کرامات اور خرق عادات سے اپنے آپ کو "ظاہر" کرتے تھے، روپہ بھوانی اس سے خوش نہیں تھیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک بار حقارت سے کہا تھا:

ریشس پیہ تبزا مگر وُھہ ناجن گیس
آخر دراد لایہ گُرو

(ریشہ کے سینے سے آگہی کی چنگاری بھڑک اٹھی تھی مگر ہوا کی نالی میں سما گئی۔ آخر بھڑبھونجا ہی ثابت ہوا۔)

کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد انہوں نے کرامات سے ہاتھ کھینچ لیا۔

پنڈت پیر کی شادی اُن کے والدین نے ان کے بچپن میں ہی رچائی تھی۔ جب وہ بالغ ہوئے انہوں نے باقاعدہ طور پر گھر گرہستی کو نہیں سنبھالا اور نہ ہی ازدواجی

زندگی میں کوئی کشش محسوس کی۔ وہ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ تیاگ اور تپسیا ان کی زندگی کا آدرش تھا۔ وہ اس بے پایاں سمندر میں مجذوب ہونا چاہتے تھے۔ جہاں زندگی اور موت، دکھ اور سکھ، اپنے اور بیگانے کا کوئی امتیاز نہیں جہاں دنیا کی لذت کوشی محض ایک فریب ہے۔ ان کی بوڑھی ماں کو یہ اسرار کیا معلوم؟ ان کا اصرار تھا کہ پنڈت گوبند جو خشو کے خاندان کا نام زندہ رہے۔ پیر صاحب نے ماں کا دل رکھا۔ ان کا ایک بیٹا ہوا۔ رہانند، جس نے بعد میں اپنے والد کی طرح سنیاس کا مارگ اختیار کر لیا۔ رہانند کے دو بیٹے ہوئے۔ ان کا خاندان آج تک باقی ہے۔ یہ لوگ پنڈت پیر کی چھٹی پشت سے ہیں۔ ان لوگوں کے رسم و رواج عجیب و غریب ہیں۔ ان کے گھروں میں نہ شنکھ بجتا ہے نہ ٹھاکر دوارہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے پیر پنڈت کے فیض سے کبھی شتلا ماتا ان کے گھروں میں آنے کی جرأت نہیں کرتیں اور آج تک ان کے خاندان میں کبھی کسی کو چیچک نہیں نکلی ہے۔ پنڈت پیر کا استھاپن اسی جگہ ہے جہاں وہ کسی زمانے میں اقامت پذیر تھے۔ ان کا کھڑاؤں اب تک موجود ہے۔ پیر خاندان کے افراد کا کہنا ہے کہ اس استھاپن میں کسی زمانہ میں ایک خزانہ پایا جاتا تھا، جس سے حسب ضرورت اہل خاندان کی مراد پوری ہوتی تھی۔ لیکن ان کے اپنے حرص، کم مائیگی اور خود غرضی نے ان سے یہ خزانہ چھین لیا۔

پنڈت ریشہ پیر اپنے تقدس اور عارفانہ کمالات کے باعث سے ہندو اور مسلمانوں میں یکساں عزت اور اعتقاد کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ۱۶۹۷ء میں لب اکھ کرشن پکشن کی سرشٹی کو ساٹھ سال کی عمر میں اسی دن سورگباش ہوئے جس دن وہ پیدا ہوئے تھے۔ روایت ہے کہ ان کے سورگباش ہونے کے بعد ان کا جسد خاکی غائب ہو گیا تھا۔ مورخ حسن لکھتے ہیں:-

"ایک پہر رات گزرنے پیران کا انتقال ہوا۔

ان کی لاش کو دریا پر لے جا کر دھویا اور کفن پہنایا گیا۔ مسلمانوں کو خبر ہوئی ہجوم کرکے دوڑے۔ دیکھا کہ تختہ پر کفن ہی ہے اور کچھ نہیں۔ ہندوؤں نے تختہ اور کفن جلا دیا۔"[۱]

اور اس طرح سے ایک مجذوب کامل، ایک پاک روح، اپنے کشف اور روحانی کمالات کی زندہ تاریخ چھوڑ کر روایت کا ایک حصہ بن گیا۔

●●

---

[۱] تاریخ اولیائے کشمیر، ص ۴۵۸-۴۵۹

کشمیری لوک گیتوں کا سماجی پس منظر

یہ بتانا آسان نہیں کہ لوک گیت کب پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ صدہا سال پہلے انسان نے جب ایک سماجی زندگی میں رہنے بسنے کا سلیقہ سیکھا۔ غالباً لوک گیتوں نے اسی زمانے میں جنم لیا ہوگا۔ زمانہ قدیم کے انسان نے جب خوابوں کو اپنی آنکھوں میں تھرکتے ہوئے دیکھا ہوگا یا اپنے آپ کو غموں اور دکھوں سے نڈھال پایا ہوگا یا اپنی مشقت کے بوجھ خوشیوں کے وفور، گزری ہوئی زندگی کی تلخ کامیوں، ناآسودہ جذبوں کے اظہار یا مستقبل کی تمناؤں کا احساس کیا ہوگا تو گول گاں کرتے ہوئے گنگناتے ہوئے لوک گیتوں کی کسی فارم نے تشکیل پائی ہوگی۔

لوک گیتوں کی کوئی سلسلہ وار تاریخ نہیں ہے۔ دنیا بھر کے لوک گیتوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ تو ہر جگہ وہی درد و کسک کی دھیمی دھیمی آنچ وہی تمناؤں کے خواب، آنکھوں کے پپوٹوں کو تر کرنے والے وہی آنسو نظر آتے ہیں جو ہماری لوک شاعری میں

ملتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی جذبات اور محسوسات آفاقی ہیں اور دنیا کا کوئی قانون کوئی دستور کوئی احتساب ان کے ٹکڑے نہیں کرسکتا۔ لوک گیت غیر تحریر شدہ انسانی دستاویز ہیں جو سینوں کی تختیوں پر لکھے گئے ہیں اور نسل در نسل منتقل ہوتے آئے ہیں۔ یہ داستانیں ہیں۔ ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کی، جواب اس دنیا میں نہیں لیکن ان کے تجربات اور محسوسات ہماری قیمتی میراث ہیں۔ ان میں ایسی ہی مہانتا ایسی ہی مدھرتا، ایسی ہی وارفتگی اور ایسی صدا ہوتی ہے جو آہستہ آہستہ دل کے نہاں خانوں میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یہ گیت زماں و مکاں کی قید سے لاتعلق انسانی جذبات کے ضامن ہیں چین کے مشہور قلم کار لوہسن نے ایک دفعہ بالکل صحیح کہا تھا:۔

"لوک گیت ان ہیروں کی طرح ہیں جو صدیوں
سے دھرتی کے سینے میں دفن ہیں اور اس دن
کے منتظر ہیں جب کوئی اہلِ نظر ان کو ہیروں
کی مانند زمین سے ڈھونڈ نکالنے کے بعد پرکھے گا۔"

تمام دوسری زبانوں کی طرح کشمیر کے لوک گیتوں کی روایات زمانہ قدیم سے چلی آرہی ہیں۔ ان میں شعر و شاعری کے بندھے ٹکے اصول نہ سہی لیکن ان کی اپنی ادبی اور لسانی اہمیت ہے۔ یہ شاعری بڑی تاریخی اور سماجی اہمیت کی حامل ہے۔

کشمیر کی لوک شاعری یہاں کی سماجی زندگی کا آئینہ ہے۔ اس میں ہم اپنے صدیوں پرانے چہرے کو دیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے گزرے ہوئے لمحات، ہمارا کلچر، ہماری دیو مالا ہماری سماجی بندشیں، ہمارے مصائب اس آئینے میں صاف طور پر جھلکتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارا ملک ایک زمانے تک جاگیردارانہ نظام میں مقید رہا ہے اور اس نظام نے ہماری تقدیر کی لکیروں کو مٹا کے رکھ دیا تھا۔ ہمارے حصے میں محنت، بے گار، افلاس ناداری اور بے بسی آئی تھی۔ سماجی نابرابری نے بے شمار سماجی بدعتوں کو جنم دیا اور ہماری

گھریلو زندگی میں جہیز، ساس، بہو کے جھگڑے، گھر داماد کے مصائب اور ایسے ہی دوسرے مسایل داخل ہوئے۔ پسماندگی کا یہ عالم تھا۔ کہ آئے دن قحط سالی، سیلاب کی تباہ کاریاں آتشزدگی کی وارداتیں، جاڑے کی شدت اور دوسری مصیبتیں ہمارا منہ چڑاتی تھیں۔ ہماری لوک شاعری نے وقت وقت پر ہمارا ساتھ دیا ہے اور ان تمام موضوعات کا احاطہ کرلیا ہے۔ اس نے ہمیشہ بدلتے ہوئے سماجی حالات کی عکاسی کی ہے۔ سماجی زندگی میں انسانی قدروں، رواداری، خلوص، انسان دوستی اور ایسے ہی ارفع جذبات کی جو اہمیت ہے، اس کی تصویر کشی ہمارے یہاں بھی بیشتر زبانوں کی لوک شاعری کی طرح بہت حسین انداز میں ملتی ہے۔ ہمارے لوک گیت محض الفاظ کا خوبصورت مرقع ہی نہیں بلکہ ان میں تجربات اور محسوسات کا عرق ملتا ہے۔ ان میں تخیل کی زرکاری کا احساس ہی نہیں ہوتا بلکہ اس بستی کی بوباس بھی ملتی ہے۔ ارضیت کے سارے کھرے اور کھوٹے پہلو سامنے آجاتے ہیں اور یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ ان لوگوں کی داستانِ حیات ہے جو ہم سے پہلے اس بستی میں رہتے آئے تھے اور جنہوں نے ہم کو جنم دیا۔ ہماری لوک شاعری کی یہی خصوصیت اس کو عظیم اور ارفع بناتی ہے۔

رمضان کی متبرک شامیں ہوں یا شادی بیاہ کے ہنگامے، کھیتوں میں محنت کا پسینہ بہانے کا سماں ہو یا جہلم کے سینے پر بھاری بھرکم کشتیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کٹھن سفر، لوک گیتوں کا کوئی نہ کوئی بول فضاؤں میں رس گھولنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ سالہا سال سے چلتا آیا ہے۔ محنت سے پھوٹتا ہوا پسینہ، دل کے زخموں کے ناسور، غم اور کرب کے آنسو ـــــ خود بہ خود ان نغموں کے مرہم سے سوکھ جاتے ہیں۔

ہمارے لوک گیتوں کی مقبول ترین صنف "لڑی شاہ" کے نام سے موسوم ہے۔ لڑی شاہ ایک طرح کا "BALLAD" ہے۔ اس صنف میں ہماری تاریخ کے کتنے ہی حقایق مضمر ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس صنف میں باقی اصناف کے مانند فنی چابکدستی نظر

نہیں آئی، لیکن جس بے باکی سے اس صنف میں ہماری سماجی زندگی کی عکاسی ملتی ہے کسی اور صنف میں یہ یارا نہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس صنف کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ لڈی شاہ میں کسی عوامی دلچسپی کے واقعے، کسی معقول انسانی تجربے، کسی آفت سماوی یا ہماری سماجی زندگی میں رونما ہوئے کسی اہم تجربے کو بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا انداز مزاحیہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ لوگوں کی تفریح طبع کا سامان ہوتا ہے بلکہ طنز کے زہر میں بجھے ہوئے تیر بھی ہوتے ہیں۔ لڈی شاہ سماجی زندگی میں رونما ہوئے غیر صحت مند واقعات کی دھجیاں اڑاتا ہے اور عوامی زندگی کے مسائل کی ترجمانی بہتر طریقے سے کرتا ہے۔

جاڑے کی ستم رانی کا ذکر ہو یا سیلاب کی تباہ کاریاں، کسانوں سے اناج چھیننے والے جاگیرشاہی کے سرکاری کارندوں کے مظالم ہوں یا آتشزدگی سے پریشان حال لوگوں کے مصائب، گھر داماد کی بے بسی کا ذکر ہو یا عورتوں کے مکر و فریب کے حربے، لڈی شاہ کی طنزیہ صنف ان سارے سماجی مسایل کا احاطہ کرتی ہے اور پوری صداقت اور بیباکی سے ان کا اظہار کرتی ہے۔

چند مثالیں ملاحظہ ہوں:-

یہ پروردگار کی رضا تھی
کہ "سیلاب سنگھ" زور آور ہوا
جمعے کو آسمان پر کالی گھٹا چھائی
سارے کشمیر میں خوف کی تھرتھری طاری ہوئی
لوگ ہیبت زدہ ہو گئے، اور جانیں تلف ہو گئیں
سیلاب سنگھ زور آور ثابت ہوا
"ہی جن" کا میدان پانی میں ڈوب گیا

گراٹ والے کو اپنے ساتھ بہالے گیا۔
اب صرف اس کا ایک خروار آٹا بچ گیا
سیلاب سنگھ زور آور ثابت ہوا
گراٹ والے مغرور ہو چکے تھے
وہ لوگوں کو ذبح کرتے تھے
اور خونِ ناحق پیا کرتے تھے
سیلاب سنگھ زور آور ثابت ہوا (سیلاب)

ہماری زندگی ہمارے دیہات ہیں اور دیہات کی زندگی فصلوں کی کامیابی پر منحصر ہے۔ دھان کی فصل کے لئے پانی کی بہتات ایک لازمی امر ہے۔ پانی کے سوتے سوکھ گئے تو دیہات کی زندگی کے سوتے سوکھ جاتے ہیں، بعض اوقات جب پہاڑوں پر برف کم ہوتی ہے یا بارشیں نہیں ہوتیں تو ندیاں اور نالے سوکھ جاتے ہیں۔ اس سے چاروں طرف کہرام مچ جاتا ہے اور بعض اوقات خون خرابہ بھی ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ سال ہا سال پرانا ہے۔ ہماری لوک شاعری نے اس کا احاطہ کیسے کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

پانی کی قلت نے کیا ستم ڈھائے
"آرہ والے" لوگوں نے ہنگامہ برپا کیا
گورنر کے پاس فریاد لے کے چلے
کھلے دل سے حالِ دل بیان کیا
پانی کی قلت نے کیا ستم ڈھائے!
پینے کے لئے پانی کی بوند نہیں
میدان میں شگاف پڑ گئے ہیں
دھان کے کھیت آنسو بہا رہے ہیں

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جب پاکستانی حملہ آوروں نے ہماری ریاست پر دھاوا بول دیا۔ رسل و رسائل کے سارے راستے منقطع ہو گئے۔ وادیٔ کشمیر میں خوراک اور دوسری چیزوں کی کم یابی کے ساتھ جس چیز کی کمی محسوس کی گئی وہ نمک تھا۔ نمک کی قلت کی وجہ سے بڑے دل چسپ واقعات رونما ہوئے۔ لڈی شاہ میں اس کا ذکر دیکھئے:-

نمک کی کم یابی سے کیسے خوش جمال چہرے بے نمک ہو گئے۔
نمک مہنگا ہو کر غائب ہو گیا
نمک کے بغیر کسی نعمت میں ذائقہ نہیں
نمک کی کم یابی سے ....
لوگوں نے نمک کی چوریاں شروع کر دیں
زردن نے اپنے آنچل میں نمک کے ڈلے چھپا لئے
رحتی نے قسمیں کھائیں
نمک کی کم یابی سے ....
اے لوگو! توبہ کرو
ہمارے گناہ ہماری مشکلات کے ذمہ دار ہیں
بے نمک کتنے خوان بے لذت ہیں (نمک کا قحط)

(ریا)

ذرا رک جاؤ اور میری بات سنو
میں تمہیں نمک کے قحط کی بات سناؤں
شوہر بیوی سے بدگمان ہے
اور گھریلو سامان مقفل کر دیا ہے
خود ہی بیوی کو چیزیں لا دیتا ہے

(کیونکہ) اُسے ڈر ہے کہ بیوی اسراف نہ کرے!
ذرا رک جاؤ اور میری بات سُنو
میں تمہیں نمک کے قحط کی بات سناؤں (نمک کا قحط)

انگریزوں کے کالے قانون کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے اسے یوں ہدفِ ملامت بنایا ہے:-

انگریزوں کا قانون بھی کیا قانون تھا!
رحیم بٹ نے جوں ہی غسل خانے کا دروازہ کھولا
فارسٹر کی آواز گونجی
ارے بے وقوف، غسل سے احتراز کر!
اگر تو نے طہارت کی تو تجھے
جلاوطن کیا جائے گا!

لڈی شاہ کے مزاج کے بالکل متضاد ایک اور صنف ہے جو رُوو یا روف کہلاتی ہے۔ روف خالص طور پر عورتوں کی چیز ہے۔ رمضان کی متبرک شاموں کو ہمارے آنگن روف کے سُریلے آہنگ سے گونج اٹھتے ہیں۔ کنواریاں، نئی نویلی دلہنیں اور کم عمر عورتیں اپنے گلے کے سوز سے ایک جادو جگاتی ہیں۔ روف کا آہنگ ہی اپنے رس سے دلوں میں عجیب گداختگی پیدا کرتا ہے۔ یہ شادی بیاہ کی تقاریب پر بھی بڑے اہتمام سے گایا جاتا ہے۔ نازک اندام جوانیاں دو ٹولیوں میں بٹ جاتی ہیں۔ آمنے اور سامنے اور ایک ہی جگہ پر اپنے سبک خرام قدموں کو آگے اور پیچھے دھرتی ہوئی گیت کی لے کے ساتھ تال ملاتی ہوئی روف کے مصرعے دہراتی ہوئی، اپنے دل کا سارا سوز اور ساز ملاتی ہیں۔ چوڑیوں کی کھنک اور نئے کپڑوں کی سرسراہٹ کے ساتھ جب لے بلند ہوتی ہے تو ایک سماں بندھ جاتا ہے۔ روف قدموں اور آوازوں کا رقص ہے۔ روف کے بولوں میں ایک عجیب والہانہ

پن ہوتا ہے اور من میں ایک بے نام سی تھرتھراہٹ اُبھرنے لگتی ہے۔ رؤف کے گیتوں میں کنوار پنے کے ارمان اور نئی نویلی سہاگنوں کی سسکیاں ملتی ہیں۔ میکے میں گزری ہوئی زندگی کے لمحات کا لمس، سُسرال میں اجنبیت کا احساس، جہیز کی مانگوں کے کانٹے، ساس سُسر اور نند کے طعنے، ممتا کی ٹیسیں، کلیجہ منہ کو لانے والے چرکے، سماجی بندشوں اور بدعتوں کا کھٹ راگ، ساجن کے برہ میں دل کے تاروں کو چھیڑنے والی آہ وزاری کیا کچھ نہیں ہوتا۔ ان کا بغور مطالعہ ہماری سماجی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے۔ چند مثالیں پیش ہیں:-

سکھی ری جا!
ساجن کو آہستہ سے آواز دے!
وہ مجھ سے روٹھ کر چلا گیا ہے
اُسے کیا رنج و ملال ہے؟
سکھی ری جا
میں اپنے آنگن میں چشمے کے کنارے
اس کی راہ تکتی رہوں گی
ایسا نہ ہو کہ دشمن مجھ بے بس کا مذاق اڑائیں
دیکھو شیریں کے لئے فرہاد پر کیا بیت رہی ہے؟
دیکھو لیلیٰ کے لئے مجنوں کیسے بدحال ہے؟
ہی مال کے لئے ناگرائے کیسے پریشان ہے؟
سکھی ری جا!

ساجن کی جدائی میں شرم و حیا کے سارے بندھن توڑ کے سہمی سہمی آواز ملاحظہ ہو:-

ہجر کی آگ میں خاکستر ہوں
چلے آؤ!
میں آرام میں پڑی ہوئی زلیخا
خواب سے بیدار ہو گئی ہوں
اے محبت کے سوداگر
میں چمن میں تیرے لئے
سنگھاسن بچھا دوں
اپنوں سے پامال ہوں
اے میرے پیا!

برہ کی اگنی میں جھلسی ہوئی کشمیری دوشیزہ جب اپنے محبوب کو یاد کرنے لگتی ہے تو در و دیوار شق ہو جاتے ہیں۔ اُس کا پیار اسی اگنی کی طرح پاک اور پوتر ہے۔ محبوب کے جلوے کی تلاش جنون کی حد تک پہنچ کر آواز کے قالب میں یوں ڈھلتی ہے:۔

چاروں اور تمہارا جلوہ دیکھا
اب کہاں ڈھونڈوں؟
رات دن تیری تلاش میں
پاؤں چھلنی ہو گئے
یہاں آئی تو تمہارا پرتو دیکھا
اللہ کا شکر کہ ٹھکانہ بتا دیا
لیکن — لیکن کہاں چلے گئے
جب تو میری راہ سے گزرے گا
تو میں صدیوں کی بیمار

صحت یاب ہو جاؤں!

میرے روم روم میں زندگی کی لہر دوڑ جائے

تب ہونٹوں پر مسی لگا کر

آنکھوں میں کاجل بھر کے

سولہ سنگار کر کے

تمہارے دامن کو تھام لوں

ہماری سماجی زندگی میں ساس بہو، بہو نند، بہو سسرال کے رشتوں کی بڑی اہمیت ہے آج اگرچہ زمانہ کافی آگے بڑھ چکا ہے لیکن ان رشتوں میں بندھنوں کے ساتھ ساتھ تلخیاں اب بھی ملتی ہیں۔ ہماری بہو ایک آئیڈل بہو ہے جس کے حصے میں صدیوں سے مصائب چلے آئے ہیں۔ سسرال کی سخت گیریاں، بہو کا ضبط اور لڑکی والوں کا صبر ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ہماری لڑکیوں کا اصلی گھر ازل تا ابدان کا سسرال ہے۔ یہیں اس کا جینا، یہیں اس کا مرنا، ہماری لڑکی للی الیشوری ہے۔ جس نے نیلہ وٹھ (ہماری پتھر) ہمیشہ سینے سے لگائے رکھا۔ ایک غم زدہ بہو اپنے آنسوؤں سے رؤف کو اس طرح سینچتی ہے

میں گھاٹ کی طرف چل دی

وہاں مجھے بابا ملا

وہ مجھے گھر لے گیا

سیڑھیوں پہ پھولوں کا بستر بچھا دیا

مجھے اپنے کمرے میں لے گیا

رنگ دار کمرے میں بیچ پر بٹھا دیا

میری دائیں جانب طوطا رکھا

بائیں طرف جلتی ہوئی شمع
سامنے قرآنِ مجید
میں نے دھیرے دھیرے رازِ دل اظہار کرنا شروع کیا
میری آنکھیں چھلک گئیں
بابا نے کہا
بیٹا! یہ سب سہنا ہوگا
گھاٹ سے پانی کا مٹکا لے جا!
ساس سسر کے پاؤں دھولے
جا اپنے گھر چلی جا! بیٹا رانی!
میکے میں رہنا اچھا نہیں لگتا
سسرال کی سختیاں جھیلنا سیکھ

یہ ہے ہمارا اصلی کلچر۔ ضبطِ نفس اور ایثارِ نفس کی تربیت جو ہم اپنی بیٹوں کو دیتے ہیں، یہ ساری چیزیں ہماری لوک شاعری میں سال ہا سال سے محفوظ ہیں۔

ہماری سماجی زندگی میں شادی بیاہ کی اپنی اہمیت ہے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر ہمارے گھروں میں بے شمار رسومات انجام دی جاتی ہیں۔ یہ رسومات ہندو گھرانوں میں بھی ہوتی ہیں اور مسلمان گھرانوں میں بھی۔ "ونہ وُن" لوک شاعری کی وہ صنف ہے جو ایسے ہی موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ دلہن کے بال گوندھنا، غسل کرنا، پوشاک بدلنا، بال بنانا، مہندی لگانا، بیاہ کا لباس زیب تن کرنا، سسرال جانا، برات کا استقبال، نکاح خوانی یا لگن منڈپ پر کنیا دان، دلہن کی رخصتی، یگنوپویت کے گیت غرض کون سی رسم ہے جس کا ذکر ان گیتوں میں نہ ہو۔ حق تو یہ ہے کہ اگر یہ گیت نہ ہوں تو شادی بیاہ محض ایک خشک اور سپاٹ لین دین بن جائے! یہ گیت ایسی

تقاریب میں رنگ بھرتے ہیں۔ "ونہ ون" کے گیت بلیغ ہوا کرتے ہیں۔ ہر گیت اپنی تقریب کے لئے مخصوص ہیں اور تقریب کا ایک وضاحتی بیان ہے۔ ان گیتوں میں عورتیں اپنے خاندان اور اہل خاندان کی عظمت کے گیت گاتی ہیں۔ تمام متعلقین کے لئے دعائے خیر کرتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ سماج کے ڈھائے ہوئے مظالم اور زمانے کی بے راہ روی پر طنز بھی کرتی ہیں۔ لیکن ان گیتوں کا سب سے جاندار حصہ وہ ہے۔ جس میں بابل کے گیت چھیڑے جاتے ہیں۔ لڑکی کو وداع کرنے کے گیت، ان بولوں میں ایسی غم انگیزی ہوتی ہے کہ رقت طاری ہو جاتی ہے اور سننے والا دل مسوس کر رہ جاتا ہے۔ ان گیتوں کی افادیت اس لئے بھی زیادہ ہے کیونکہ ان میں ہمارا سارا معاشرہ ہندو اور مسلمانوں کی ریت، رواج کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کے ہاں یہ گیت مختلف انداز کے ہیں لیکن جہاں تک موضوع کا تعلق ہے وہ یکساں ہے۔ اس میں وہی آفاقی حقیقت پنہاں نظر آتی ہے۔ وہی انسانی درد و کسک، وقت کی تیز رفتاری نے ان گیتوں میں کہیں کہیں تبدیلی پیدا کردی ہے اور آج کے گیتوں میں نئی چیزوں کا اضافہ ہوا ہے جو ہم آئے دن کی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس طرح سے بعض پرانی چیزیں حذف ہو چکی ہیں۔ اس صنف کی چند مثالیں پیش ہیں۔

رخصتی

پشمینے کا دوشالہ ہے اور ریشم کا لباس

جا بیٹیا تیرا سہاگ قائم رہے

اے حور، تو ڈولی میں چھپی بیٹھی ہے

اے مستور، اب تو خموش کیوں ہے؟

جا تو حضرت بل کی سمت آبادرہ
اور ڈل میں کشتیوں کی سیر کر!

(یا)

اندھیرے میں موتیوں کی مالا تیرے ہاتھ آگئی ہے
تو نے ہماری مینا کو باتوں میں پھسلایا ہے
مجنوں جاروں اور کھوج رہا ہے
کس دریچے سے شاہ پری جلوہ گر ہو!
پال پوس کر اسے تیرے حوالے کر رہے ہیں
خدا کا واسطہ ہے اس کی دیکھ بھال کرنا
ہم پہلے ہی کہہ چکے
ہماری بیٹی معصوم ہے
اس کا بیاہ تم سے کبھی نہ ہوتا!
ہم تمہاری باتوں میں آکر بہک گئے

(یا)

اب تک تو ہمارے گھر کی رکھوالن تھی
جا ماں کی لاڈلی! اب سسرال کی راہ لے!
پہلے پھر لوٹنے کا وعدہ کر!
پھر اپنے ساجن کے ساتھ جا

کشمیری پنڈتوں کے "وَنہ وُن" میں ان کی دیومالائی تلمیحات کا بھرپور استعمال نظر آتا ہے۔ جذبات وہی ہیں جو دوسرے لوک گیتوں میں نظر آتے ہیں۔ مثلاً

ہاتھی بوجھ سنبھالے بڑھا رہے ہیں اور دولہا گھوڑے پر سوار

ہماری مینا کا دولہا سپیلے پرندے میں آیا ہے
سُبھدرا کا داتا دیو بابا سلامت رہے
زر لبفت کا لباس وہ لندن سے لایا ہے
سمندر پر صندل کی لکڑی سے بندھ لگوایا
دُولہا رام چندر کی راہ سے آیا ہے۔
اے سوریہ بھگوان! تو پورب سے طلوع ہوا
اب پچھم کی طرف کرنیں بکھیر
وشوامتر بابا اور مینکا میّا کے لئے
دور قندھار کا راجہ آیا ہے!

دوسری طرح کے لوک گیتوں میں "وژن" (گیت) "ہیری ہاتھ" (چرواہوں کے گیت) نیندرہ ہاتھ (کھیتوں میں نلائی کے گیت) وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "وژن" کے گیتوں میں پیار و محبت کا وہی ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا ہے۔ یہ گیت بھی شادی بیاہ کی تقاریب پر گائے جاتے ہیں۔ "ہیری ہاتھ" اور "نیندرہ ہاتھ" ہمارے محنت کش طبقہ کے گیت ہیں۔ مسلسل محنت کی تکان سے جب ہمارے چرواہے اور کسان شل ہو جاتے ہیں تو ان کے لبوں سے نغمے پھوٹتے ہیں۔ یہ نغمے ان کے تھکن سے چُور، ٹوٹے ہوئے جسم میں زندگی کی حرارت پیدا کرتے ہیں اور وہ ایک نیا عزم لے کر کام میں جُٹ جاتے ہیں۔

ہمارے لوک گیتوں میں نہ صرف ہماری دیومالا کا عکس نظر آتا ہے بلکہ ان کو پڑھ کر ہماری خوراک، ہماری ضیافتیں، ہمارا لباس، ہمارا سامانِ آرائش، ہمارے اعتقادات، ہمارا دین اور دھرم، ہمارے موسموں کے رنگ اور ان کے اثرات، ہمارے رنج اور غم، خوشی اور مسرت، ہمارے توہمات، ہمارا خلوص، ہماری رواداری، ہمارے رشتے ناطے، ہمارے پرندے اور حیوان اور ہماری زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والی ہر شے اور ہماری ساری دنیا ہمارے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے۔ ہماری زندگی کے [illegible]

جموں و کشمیر میں اردو افسانہ

بیسویں صدی کے آغاز میں پریم چند اور سجاد حیدر یلدرم نے اردو افسانے کا پہلا چراغ روشن کیا۔ اسی صدی کے دوسرے اور تیسرے دہے میں یہ اردو کے نثری ادب کا سب سے مقبول شعبہ بننے لگا۔ ملکی سیاست کے شعور اور مغربی ادب کے مطالعے نے اس صنف میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی اور اردو کا مختصر افسانہ معاصر زندگی کے سیاسی، سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہوئے ترقی کے زینوں کو پھلانگنے لگا۔ اس کا اولین روپ "انگارے" کے افسانوں میں بھرپور توانائیوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا لیکن اس کے بیشتر افسانے ۱۹۳۰ء میں ہی مختلف رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔

ریاست جموں و کشمیر میں اردو زبان کی شروعات گزشتہ صدی کے اواخر میں ہوئیں اور مہاراجہ پرتاپ سنگھ نے ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہوتے ہی یہ زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی زندگی میں شاندار رول ادا کرنے لگی۔ آہستہ آہستہ تعلیمی اداروں، عدالتوں اور سرکاری محکموں میں اسے برتا جانے لگا۔

اور پھر اہلِ علم نے اسے شعر و ادب میں اپنے مافی الضمیر کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ اس صورت حال کے پیش نظر بعض کشمیری ملوں نے لاہور سے اخبارات جاری کیے۔ جن میں مراسلہ کشمیر، خیر خواہ کشمیر، بہار کشمیر، صبح کشمیر، اخبار عام، پنجہ فولاد وغیرہ خصوصیت کے ساتھ اہم ہیں۔ ان میں سے بیشتر اخبارات میں جموں و کشمیر میں رہنے والے لوگوں نے وقتاً فوقتاً لکھنا شروع کیا۔ ہر گوپال کول خستہ کا "خیر خواہ کشمیر" گوپی ناتھ گورٹو کا "اخبار عام"، محمد دین فوق کا "پنجہ فولاد" اور "کشمیر میگزین" اور افسر لال لقایا اور لچھمی نرائن کول کا "بہارِ کشمیر" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ بیسویں صدی کے پہلے اور دوسرے دہے کا زمانہ تھا۔ جب اردو افسانہ مجموعی طور پر ابھی گھٹنوں کے بل چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لئے ریاست جموں و کشمیر (وادی کشمیر میں خاص طور پر) کے اہل علم ایک دورافتادہ مقام پر ہونے کے باعث صنف افسانہ کی طرف فوری طور پر متوجہ نہیں ہوئے بلکہ بیسویں صدی کے دوسرے دہے کے اواخر میں اس نئی صنف میں سر پیر مارنا شروع کیا۔

ریاست میں اردو افسانے کی طرف سب سے پہلے مورخ، ادیب، شاعر اور صحافی منشی محمد الدین فوق نے توجہ دلائی۔ اگرچہ فوق نے زندگی کا بیشتر حصہ پنجاب میں گزارا لیکن ان کے کشمیریت کے جذبے کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتیں۔ فوق نے روشِ زمانہ کے مطابق کئی تاریخی اور نیم تاریخی قصے قلمبند کیے، جنہیں ہم ریاست میں اردو افسانے کے اولین نقوش کہہ سکتے ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس میدان میں کس سے متاثر ہوئے لیکن بہر حال ان کے طبع زاد قصوں میں کہانی کا بنیادی کینڈا ضرور ملتا ہے۔ فوق کے بعد چراغ حسن حسرت کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کی ادبی حیثیت ہمہ جہت ہے۔ انہوں نے کس صنف میں اپنا قلم نہیں آزمایا؟ تاریخ دینیات صحافت، شاعری، افسانہ۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "کیلے کا چھلکا" ۱۹۲۷ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

مدِ نظر رہے کہ ابھی ریاستی سطح پر صحافت کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۲۴ء میں ریاست کا پہلا اخبار "رنبیر" جموں سے لالہ ملک راج صراف کی ادارت میں شایع ہونے لگا۔ اس نے ریاست کے قلم کاروں کی صلاحیتوں کو اُبھرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ "اخبار عام" اور "رنبیر" کے حلقے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ پریم ناتھ سادھو رونق بھی شامل ہوئے اور اپنی ادبی زندگی کی شروعات شعروشاعری سے کی۔ لیکن ۱۹۲۲ء کے بعد وہ نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ رونق کو ادب اور خاص طور پر کہانی کی صنف کی طرف متوجہ کرنے کی تحریک ان ہی محفلوں میں ملی جو ان کے ادب نواز دادا پنڈت مکند کول کے گھر میں منعقد ہوا کرتی تھیں جہاں شعر پڑھے جاتے تھے اور اقبال اور چکبست کے ساتھ ساتھ پریم چند اور ٹیگور کی کہانیاں بھی پڑھی جاتی تھیں اور ان پر اظہار خیال ہوتا تھا۔ رونق جو بعد کے برسوں میں پردیسی کے نام سے مشہور ہوئے، ان محفلوں سے تحریک پاکر شعروادب کی دنیا میں آگئے۔ شعر کہنا شروع کئے لیکن یہ میدان راس نہ آیا۔ دراصل وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے شعری وسیلے سے اس کا بھرپور اظہار نہیں ہو پاتا تھا۔ اس دوران پریم چند کے کئی مجموعے شایع ہوئے۔ سجاد حیدر یلدرم، اعظم کریوی، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کی دھوم مچی تھی۔ پریم چند مثالیت پسندی سے حقیقت پسندی کی طرف آگئے تھے اور نئے فنی تصورات اور امکانات کے ساتھ معاشرتی اور سیاسی زندگی کو پیش کرنے لگے تھے۔ یلدرم، نیاز، مجنوں اور سلطان حیدر جوش رومانی افسانے کی بنیاد ڈال چکے تھے اور تخیلی افسانے لکھ رہے تھے۔ ٹیگور کے ادب لطیف کے ترجموں نے زبان و بیان کا جادو جگایا تھا۔ اسی فضا میں پردیسی کا ذہن پروان چڑھا اور وہ ادب لطیف اور نثری شاعری کے ادب پارے تخلیق کرنے لگے۔ لیکن پھر "انگارے" اور پریم چند کے "کفن" کی اشاعت نے ان کے ذہن کو مکمل طور سے بدل دیا۔ اس زمانے میں ڈوگرہ شاہی کے جبرواستبداد کے خلاف ہماری تحریک آزادی کا آغاز ہوا تھا جو شیخ محمد عبداللہ کی قیادت

میں ایک نئے مرحلے میں داخل ہو رہی تھی۔ پردیسی جیسا حساس فنکار ان تمام باتوں سے دامن نہ بچا سکا۔ چنانچہ ابتدائی دور کے ادب لطیف اور راحو کی ڈولی، پارسل، مال کا پیار، جے کارا، سنتوش، حسین پیامبر، سندھیا کا شراپ اور "شام و سحر" (اولین مجموعہ) کی کئی کہانیوں کی طرح، جن میں زندگی کی مہک سے خالی رومان اور جذبات سے بھرے ہوئے خواب ہیں۔ ان کا رومانی اسلوب آہستہ آہستہ بدلنے لگتا ہے اور اس کی بجائے وہ سیدھے سادے انداز کو اپناتے ہیں۔ وہ اپنے فن کو حسب موضوع سے قطع نظر انسانی نفسیات کی باریکیاں ضرور نظر آتی ہیں اب زندگی کے خارزار میں پہنچا دیتے ہیں اور آخری سانس تک صحیح معنوں میں کشمیر اور کشمیریت کو اپنے اصلی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔

پردیسی کے افسانوں کے دوسرے مجموعے "دنیا ہماری" کا اسلوب "شام و سحر" کے افسانوں سے مختلف ہے اور بقول راجندر سنگھ بیدی یہ افسانے اپنی سادگی اور معصومیت کی بناء پر ٹالسٹائی کی یاد دلاتے ہیں۔ پردیسی کے تخلیقی سفر میں ان میں سے بیشتر کہانیاں اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ ان میں مشاہدے اور مطالعے کا خلوص ملتا ہے۔ لیکن یہاں کوئی جوش، کوئی غصہ، کوئی تلملاہٹ نظر نہیں آتی جو ترقی پسند مصنفین کے یہاں ابتداء میں نظر آتی ہے۔ حالانکہ یہ کہانیاں اسی زمانے کی پیداوار ہیں۔ لیکن ان کی تہہ میں ایک تند و تیز طوفان کے آثار واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

پردیسی کے یہاں کشمیر کے قدرتی حسن کا بہت کم ذکر ملتا ہے۔ انہوں نے یہاں کے حسین جھرنوں، سدا بہار جنگلوں اور برفیلے پانیوں کا ذکر بھی بہت کم کیا ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے یہاں کے تپتے ہوئے جہنم کدوں کی تصویر کشی کی ہے بھوک کو بہلاتے ہوئے کاریگروں کا ذکر ملتا ہے۔ بوجھ ڈھونے والے ہاتوؤں اور ڈڑواروں کے استحصال کے شکار کسانوں کا ذکر ملتا ہے۔ وہ نہ مصلح ہیں اور نہ سیاسی

خطیب بلکہ ایک سچے فن کار کی طرح معروضی طور پر واقعات کی کڑیاں ملاتے جاتے ہیں۔ پردیسی کے نزدیک کشمیر کا سب سے بڑا مسئلہ غلامی اور افلاس ہے جس کی طرف کسی نے توجہ نہ کی۔ انہیں اپنے معاصرین اردو کے بیشتر غیر کشمیری افسانہ نگاروں سے شکایت ہے جنہوں نے کشمیر کو محض عیش گاہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ خود ایک مضمون میں لکھتے ہیں :-

"کشمیر کا ہر بدنصیب باشندہ خود ایک افسانہ
ہے جس کی طرف آج تک کسی نے توجہ نہ دی۔
باہر کے چند نامور افسانہ نگاروں نے کچھ کہانیاں
ضرور لکھیں مگر وہ بھی غلط انداز میں۔۔۔۔۔۔۔۔ یہاں
پر سب سے بڑا مسئلہ غلامی ہے، افلاس ہے" [۱]

پردیسی کے فن کا آخری دور ۱۹۴۷ء کے آس پاس شروع ہوتا ہے۔ اب ان کے شعور میں پختگی پیدا ہو چکی تھی۔ ڈوگرہ شاہی کا شخصی نظام آخری ہچکیاں لے رہا تھا اس لئے ان کی تاناشاہی اور جور و استبداد میں اضافہ ہو چکا تھا۔ یہاں شخصی نظام کے استحصال کے خلاف پردیسی نے بھرپور وار کیا۔ "بجھتے چراغ" اور دوسرے غیر مطبوعہ مسودات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کے لہجے میں زہرناکی پیدا ہو چکی تھی۔ وہ کشمیر کے مخصوص معاشرے کے تناظر میں کشمیری لوگوں کے مزاج، ان کی اخلاقی قدروں ان کی آرزومندیوں اور ان کی جدوجہد حیات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ اس زمانے میں بالک رام باری اور کئی دوسرے ناموں سے بھی لکھتے ہیں۔ اس دور میں لکھی ہوئی کہانیاں پردیسی کی نمائندہ کہانیاں ہیں اور مختلف موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ زبان کا برتاؤ، لہجے کی چستی اور بیان کا اختصار بھی ان کے فن کو نکھارتا ہوا نظر آتا ہے۔ ریاست میں اس سے پہلے اردو کا مختصر افسانہ اس قدر منجھی ہوئی

---

[۱] افسانہ الہ آباد نمبر ۸۔ ص ۵

صورت میں نظر نہیں آتا۔ پردیسی نے کشمیر کو اپنے افسانوں میں پہلی بار پیش کیا اور ہزاروں لاکھوں کشمیریوں کو زبان بخشی۔ وہ پہلے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے ہندوستان کے بے شمار اردو پڑھنے والوں میں ہلچل پیدا کر دی اور ایک نئے لہجے میں اصلی کشمیر کی تصویر کھینچی جس کی طرف اس سے قبل صرف ہوس کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس لئے صحیح معنوں میں کشمیر میں اردو افسانے کی شروعات پردیسی سے ہی ہوتی ہیں۔

پردیسی کے قریبی معاصرین میں پریم ناتھ درؔ کا نام اہم ہے۔ وہ پردیسی کے بعد اس میدان میں آئے اور بیسویں صدی کے چوتھے دہے میں اچانک اردو افسانے کے آسمان پر طلوع ہوئے۔ شروع شروع میں وہ پردیسی، رامانند ساگر اور دوسرے مقامی تخلیق کاروں کے ساتھ سرینگر کی ادبی انجمنوں میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے اپنے فن کا لوہا ۱۹۴۷ء کے بعد منوایا۔ درؔ کا بیشتر وقت کشمیر سے باہر گزرا لیکن وہ کسی حال میں بھی کشمیر کو نہیں بھولے۔ پردیسی کے ساتھ اور ان کے بعد جس افسانہ نگار نے کشمیریت کا احساس دلایا ان میں درؔ کا نام سرفہرست ہے۔ پردیسی ہی کی طرح درؔ نے بھی کشمیر کی جنت کا ذکر بہت کم کیا ہے بلکہ بقول سید احتشام حسین "کشمیر جو بار بار ان کے افسانوں میں آتا ہے۔ اپنی وہ جنت بدوش عظمتیں لئے ہوئے نہیں آتا جس سے رومانوں کا افسوں جگانے کے لئے فضا تیار ہوتی ہے۔ بلکہ ان میں وہ غم آلود اور نشتر آگیں کسک بھرتا ہے جس سے ہم کشمیر کی حقیقت کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ [۱]" اور وہ حقیقت یہاں کی ناداری، بھوک اور جاگیردارانہ نظام کی ماری ہوئی زندگی ہے۔ پریم ناتھ درؔ کے ہاں غضب کا باریک مشاہدہ نظر آتا ہے۔ وہ اس بے چارگی اور لاچاری کی تہوں تک ٹٹول کر نیچے جاتے ہیں اور ان حقائق کو بے نقاب کرتے ہیں جس نے یہاں کے عوام کو افلاس اور بھوک کی اندھی غاروں میں دھکیل دیا تھا۔ درؔ کے موضوعات ہماری آس پاس کی زندگی اور اس سڑے ہوئے معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں اور ان میں زندگی اس قدر قریب محسوس ہوتی ہے۔ جیسے ہمارے پاس

[۱] پریم ناتھ درؔ "کاغذ کا واسدیو" (پیش لفظ)

سانس لے رہی ہو۔ درؔ کا فنی کمال اس تاثر اور فضا کے باعث ہے جن سے ان کا افسانہ عبارت ہے۔ اس کیفیت کو پیدا کرنے کے لئے ان کے اسلوب کی سادگی اور زبان و بیان کا مناسب استعمال کافی حد تک ذمہ دار ہے۔ ان کے یہاں تشبیہات اور استعارات کا ایسا نادر خزانہ ہے جس پر رشک آتا ہے۔ زبان کا برتاؤ غضب ڈھاتا ہے۔ اس ضمن میں ریاست کا کوئی افسانہ نگار ان کے مدِ مقابل کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ پریم ناتھ درؔ کے افسانوں کے صرف دو مجموعے شایع ہوئے ہیں۔ "کاغذ کا واسدیو" اور "نیلی آنکھیں"۔ اس کے علاوہ برصغیر کے رسالوں میں ان کے افسانے شایع ہو چکے ہیں اور نہ صرف یہ کہ ریاست میں ان کا نام ہے بلکہ اردو کے افسانوی ادب میں وہ ایک نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ درؔ کا محبوب موضوع انسان اور انسانی سرشت ہے۔ ان کا یہ مطالعہ اس قدر گہرا ہے کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ لاہور سے شایع ہونے والے معروف رسالے "ادبی دنیا" کے مدیر نامدار مولانا صلاح الدین احمد کو ایک زمانہ میں اردو کے افسانوی ادب میں جمود کا احساس ہوا تھا۔ لیکن جب درؔ نے اپنا افسانہ "غلط فہمی" اس میں شایع کروانے کے لیے بھیج دیا تو مولانا کو جمود ٹوٹنے کا یقین ہو گیا تھا۔ درؔ نے فن کا پرچم ان دیکھے میدانوں میں جا گاڑا تھا اور افسانوی حدود کو آگے بڑھایا تھا۔ [1]

پردیسی کے معاصرین میں کئی اور نام شامل کئے جا سکتے ہیں جنہوں نے ریاست میں اردو افسانے کو وقار بخشا اور اپنے انداز سے مختلف سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسایل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان میں سے بیشتر لوگ ٹیگور اور پریم چند کے ابتدائی دور کی کہانیوں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانوی مجموعے شایع نہیں ہوئے۔ البتہ یہ لوگ بھی کافی عرصہ تک لکھتے رہے اور مقامی اخبارات میں ان کی کاوشیں شایع ہوتی رہیں۔ ان میں خاص طور پر دینا ناتھ وارثیکھ، بیتر تھ کاشمیری، شیام لال ایمہ، دیر و لیشور، نند لال بے غرض، دینا ناتھ دلگیر، اسیر کاشمیری، اختر عسکری، کوثر سمائی، کیف اسرائیلی،

[1] پریم ناتھ در۔ نیلی آنکھیں ص ۱۳

محمود ہاشمی، دیا کرشن گردش، عزیزہ کاش، مجوبہ یاکیفیت، صاحب زادہ محمد عمر، کاشی ناتھ کنول، گلزار احمد فدا، جگدیش کنول، غلام حیدر چشتی کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

اس دور کے لکھنے والوں میں رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس (مولا رام کوٹی) کشمیری لال ذاکر، گنگا دھر دیہاتی کے نام خاص طور پر نام لئے جا سکتے ہیں۔ ساگر، شہاب اور ذاکر اب ریاست میں نہیں۔ لیکن ان کی کہانیوں اور خاص طور پر ابتدائی کہانیوں میں اس سرزمین کی بو باس کا احساس ہوتا ہے۔ شہاب مستقل طور پر پاکستان چلے گئے اور اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اور رامانند ساگر بھور بی کدل کی گلیوں کو ترک کر کے بمبئی کی فلمی دنیا کے گلیمر میں کھو گئے اور کافی اچھی فلمیں بنائی ہیں۔ ذاکر اپنے تخلیقی کارناموں میں مسلسل مصروف ہیں۔ انسانی زندگی اور استحصالی نظام میں پسے ہوئے عوام (شروع کی کہانیوں میں) ان کے خاص موضوع ہیں۔ اس پر ان کا قابل رشک اسلوب۔ ذاکر نے اردو کی افسانوی دنیا میں اپنا مقام بنا لیا ہے۔ گنگا دھر دیہاتی بڑے زود نویس تھے۔ کافی عرصہ تک صحافت کے ساتھ وابستہ رہے۔ دیہاتی اور دلکش کاشمیری کے قلمی نام سے ریاستی اور ملکی رسائل میں کہانیاں لکھتے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے منی کہانیاں لکھنا شروع کی تھیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ دیہاتی نے بھی اپنے معاصرین کی طرح سیاسی اور سماجی مسائل کو اپنا موضوع بنا لیا تھا۔ انہوں نے معاشی اور اقتصادی بدحالی، سرمایہ اور محنت کی کش مکش اور اپنے عہد کے دوسرے سماجی مسائل کو کہانیوں میں ڈھالا تھا۔ ان کا کوئی مجموعہ شائع نہ ہو سکا کہانی کے فن اور تکنیک کی تازہ کاری کا جس قدر ادراک دیہاتی کو تھا۔ ریاست کے بہت کم کہانی کاروں کو حاصل ہو سکا۔ نرسنگھ داس نرگس عرصہ دراز تک مولا رام کوٹی اور پریم صنوبر کے نام سے لکھتے رہے ان کی کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "دکھیا سنسار" اہم ہے صحافت سے وابستہ رہنے کے باوجود نرگس بہت اچھی کہانیاں لکھتے ہیں ان کی کہانیوں میں دیہاتی زندگی کی عکاسی خاص طور پر نظر آتی ہے اس

کے علاوہ اپنے وطن کی بدحالی اور جاگیردارانہ نظام کے استحصال کو اپنی کہانیوں میں بے نقاب کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نرگس نے دیہاتیوں کی آرزومندیوں پر خاص طور پر توجہ کی ہے۔ ان ارمانوں کے پس پشت غم اور ملال کی دھیمی دھیمی آنچ ملتی ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد اردو افسانہ کئی زینے طے کرتا ہوا آگے بڑھا ہے۔ نہ صرف موضوع کے اعتبار سے افسانے کا کینڈا بدل گیا ہے بلکہ فن تکنیک اور تکنیک کے برتاؤ کے اعتبار سے بھی افسانہ کہیں سے کہیں پہنچا ہے۔ اس دور سے قبل اور اس کے بعد پردیسی، درد، دیہاتی، ذاکر مسلسل لکھتے رہے۔ لیکن اس فہرست میں کئی اور ناموں کا اضافہ ہوا خصوصی طور پر ٹھاکر پونچھی، موہن یاور وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جنہوں نے ۱۹۴۷ء سے قبل ہی لکھنا شروع کیا تھا۔ وہ اپنے چونکا دینے والے انداز تحریر سے قارئین کی توجہ کا مرکز بن گئے۔ ۴۷ء کے بعد ان کے فن نے ترقی کی منزلیں طے کیں۔ ٹھاکر نے اپنے افسانوں میں پونچھ اور جموں کے آس پاس کی زندگی کے رنگ بھر دیئے اور اپنے منفرد اسلوب سے اپنا مقام بنالیا۔ موہن یاور منجھے ہوئے فن کار ہیں۔ وہ کہانی کے فن پر قادر ہیں۔ منٹو اور بیدی کی طرح الفاظ کے کم از کم استعمال سے تاثر کی وحدت قایم کرتے ہیں۔ وہ شاعری نہیں کرتے اور اس راز کو سمجھ گئے ہیں کہ مختصر افسانہ اختصار اور کفایت الفاظ کا فن ہے۔ موہن کے یہاں عصر حاضر کے انسان کا درد و کرب ملتا ہے۔ "سیاہ تاج محل" "وسکی کی بوتل" اور "تیسری آنکھ" میں موہن یاور کے فن کی پختگی کا احساس ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ — ۱۹۴۸ء میں ہماری ریاست سیاسی اعتبار سے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔ اس کا اثر لازمی طور پر یہاں کی سماجی، ثقافتی اور ادبی زندگی پر بھی پڑا۔ نئے تقاضوں کے پیش نظر "قومی کلچرل فرنٹ" کی بنیاد پڑی اور گوشہ نشینی میں پڑے ہوئے ہمارے فن کار بھی میدان میں کود پڑے۔ کلچرل فرنٹ کی بنیادوں پر کلچرل کانگریس کی عمارت کھڑی ہوئی اور یہاں سے ہماری ثقافتی اور ادبی زندگی کا احیائے نو ہوتا ہے۔

کلچرل کانگریس کے سائے تلے ڈوگری اور کشمیری زبانوں کے شعر و ادب کی آبیاری ہوتی رہی۔ نئے لکھنے والوں کا ایک کارواں سامنے آیا۔ اردو افسانے کے میر کارواں پریم ناتھ پردیسی ہی تھے۔ نئے لکھنے والوں میں سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش، دیپک کول، تیج بہادر بھان، دیدرامی اور کچھ عرصہ بعد پشکر ناتھ، حامدی کاشمیری برج پریمی، امیش کول، ہری کرشن کول، غلام رسول سنتوش، جگدیش بھارتی، برج کتیال، زیڈ ہیمی، نور شاہ، محمود بدخشی، وجیہہ احمد اندرابی، رام کمار ابرول وغیرہ اس کارواں میں شامل ہوئے اور اپنی کہانیوں میں نئے تقاضوں کی ترجمانی کی۔ ان لوگوں کے یہاں موضوع اور اور ہیئت کے لحاظ سے نئے تجربے ملتے ہیں۔ یہ افسانہ نگار ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اس لئے ان کے یہاں محنت کش طبقہ اور ریاستی عوام کی ترجمانی کا احساس ہوتا ہے۔

اس دور تک آتے آتے ہمارا افسانہ قدیم روایتوں سے انحراف کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان افسانہ نگاروں کے یہاں خالی خولی رومان کے رنگ نظر نہیں آتے بلکہ حقیقت کی تلخیاں سامنے آتی ہیں۔ اس لئے ان کے یہاں بعض اوقات طنز کے تیکھے وار بھی ملتے ہیں اور ایک خصوصیت جو اس دور کے کہانی کاروں میں عام طور سے نظر آتی ہے وہ کشمیر اور کشمیریت کا احساس ہے۔ جموں خطے سے تعلق رکھنے والے دوستوں نے پتھروں کے شہر کی مخصوص کہانیاں لکھیں اور اس حسن کو کھنگھالا جسے جاگیردارانہ نظام کے جبر نے مسخ کر دیا تھا۔ افسانے کے فارم میں ڈھلنے کی اس روش کی توسیع ایک نئے انداز سے ہوتی ہے جس کی طرح پردیسی اور درد نے ڈالی تھی۔

اختر محی الدین نے اپنے ادبی سفر کا آغاز اردو افسانہ نگاری سے کیا اس کے بعد وہ کشمیری میں لکھنے لگے۔ کشمیری زبان کے افسانہ نگاروں میں آج ان کا نام سرفہرست ہے لیکن اردو میں ان کی شروعات کسی طرح بھی کم تر درجہ کی نہیں۔ "پوندرچ" نام کی کہانی میں انہوں نے اپنے وطن کا کرب جس طرح انڈیل دیا تھا وہ ان کی فن کارانہ صلاحیت

پروان تھا۔ یہ کہانی اُس سال کی بہترین کہانی قرار دی گئی اور ایک غیر ریاستی اخبار کے "مختصر افسانہ کے مقابلے" میں پہلے نمبر پہ آگئی تھی۔ اختر کی کہانیوں میں مشاہدے کی گہرائی ملتی ہے وہ اپنی بات برجستہ انداز میں کہتے ہیں۔ اسلوب میں مزاح کی چاشنی ہے اور یہ مزاح کی شکر میں لپٹا ہوا طنز اسے دو آتشہ بنا دیتا ہے۔

تیج بہادر بھان ۱۹۵۱ء سے لکھتے آرہے ہیں اور اب تک لکھ رہے ہیں۔ کلچرل کانگریس کے ساتھ وابستگی کے باعث شروع میں "لال چُنری" اور "سرمایہ دار کا خواب" جیسی کہانیاں لکھیں۔ ان کہانیوں میں فن سے زیادہ پروپگنڈے کی بو آتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ تیج کا فن نکھرتا گیا اور آج ان کے یہاں کہانی کے فن کا ایک بھرپور اور نکھرا ہوا انداز ملتا ہے۔ تیج اس فن میں کسی کے مقلد نہیں، وہ نہ کسی فارمولے کے پابند ہیں اور نہ کسی تیکنک کے۔ انہوں نے اپنے لئے ایک مخصوص تیکنک وضع کرلی ہے۔ تیج نے کلچرل کانگریس کے زمانے میں ہی اپنی کہانی "واکسین" سے لوگوں کو چونکا دیا جو خواجہ احمد عباس کے رسالے "سرگم" میں چھپی تھی اور جس نے انعام بھی حاصل کیا تھا۔ تیج کے یہاں زبان کا برتاؤ عام طور سے عدم صحت کی وجہ سے ان کے معترضین کا نشانہ رہا ہے۔ ان سے انشاء اور املا کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں لیکن مختصر افسانے کے لئے جس ٹکنیک اور جس فنی چابکدستی کی ضرورت ہے ہمارے یہاں شاید ہی کسی افسانہ نگار کو اس معیار کی ہنرمندی حاصل ہے۔ "جہلم کے سینے پر" سے "عورت" تک تیج بہادر بھان نے خاصا تخلیقی سفر طے کیا ہے۔ ان کے خاص موضوعات میں نفسیاتی اور سماجی مسائل ہیں جن کو انہوں نے تخلیقی آرٹ کے حسن کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دیپک کول میں ایک اچھے کہانی کار کی سب خوبیاں موجود تھیں۔ لیکن اب وہ ہندی میں لکھنے لگے ہیں اور عرصہ سے اردو میں ان کی کوئی کہانی نظر سے نہیں گزری ہے۔ دیپک بھی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے اور کلچرل کانگریس کے سرگرم رکن تھے۔ دیپک کول کو

زبان پر قابلِ رشک حد تک قدرت حاصل تھی۔ ہندی اور اردو کی آمیزش سے انہوں نے اپنا اسلوب نکھارا تھا۔ ان کے موضوعات میں بھی وقت کے تقاضوں کی گونج تھی۔ شیڈرک کے نام ایک خط، جب گدھ ڈوب گئے، بات کل رات کی، ناقابلِ فراموش کہانیاں ہیں۔ اُمیش کا "یاقوت" دائرے اور مرکز، ہنسی نردوش کا "تار سوت" لون کا پاپی پچکاری، بُت شکن اور سکھ کا ساحل، سنتوش کا "خزاں کی خوشبو" اسی دور میں لکھی گئیں اور توجہ کا مرکز بن گئیں۔ تار سوت اس دور کی نمایندہ کہانی تھی۔

پشکر ناتھ دورِ حاضر کے اہم کہانی کار ہیں۔ ان کے چار مجموعے "اندھیرے اُجالے" "ڈل کے باسی" اور "عشق کی چاند اندھیرا" "کانچ کی دنیا" شائع ہو چکے ہیں۔ پشکر نے ایک رومان نگار کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا وہ "بیسویں صدی" دہلی کے توسط سے کشمیر میں پہنچانے گئے لیکن بہت جلد انہوں نے اپنے منصب کو پہچان لیا اور رومانوں سے اتر کر انہوں نے کشمیر کی زندگی کے کرب کو اپنے افسانوں میں ڈھال دیا۔ پشکر کا مشاہدہ عمیق ہے وہ فلسفہ نہیں بگھارتے اور نہ سیاست کے کرتب دکھلاتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی سے اپنی کہانیوں کا مواد اخذ کرتے ہیں۔ پشکر ناتھ کی کہانیوں میں جذبے اور احساس کا ادراک ملتا ہے اور ایک منجھا ہوا شعور بھی۔ ان کو زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے جس کی مدد سے انہوں نے خوب سے خوب تر لکھا ہے۔ پشکر نے اپنے طویل تخلیقی سفر کے دوران فارم کے کئی تجربے کئے ہیں۔ کئی کہانیاں انہوں نے ناول کی تکنیک میں لکھی ہیں بعض میں داستانی تکنیک کا التزام کیا ہے۔ اور بعض میں صرف بیانیہ انداز ملتا ہے۔ کہیں کہیں چشمۂ شعور کی تکنیک کو بھی برتا ہے۔ پشکر بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ بدلے ہیں۔ مشاہدے کے ساتھ ساتھ ان کے مطالعے کا آہنگ بھی ان کی نئی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ "کہانی پھر ادھوری رہی" سے لے کر "عشق کا چاند اندھیرا" تک پشکر نے ایک طویل تخلیقی سفر طے کیا ہے ادھر چالیس برسوں میں انہوں نے چند

کہانیاں ایسی بھی لکھی ہیں جن میں ابہام، علائم، تجریدیت اور جدید کہانی کی بیشتر خصوصیات کو شعوری طور پر اپنانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے افسانوں میں "قصہ پن" کی خصوصیت سے اجتناب نہیں کر سکے ہیں۔

نور شاہ بنیادی طور شاعرانہ ذہن رکھتے ہیں۔ ان کا اسلوب بھی شاعرانہ ہے جس سے ان کی کہانیوں میں قوس و قزح کے رنگ آ گئے ہیں اور اس خصوصیت نے نور کے افسانوں کو ایک انفرادیت بخش دی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ نور شاہ افسانہ بننے کے گُر سے بھی واقف ہیں۔ وہ انسانی زندگی کی مجبوریوں اور ناکامیوں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ جس سے ان کے افسانوں میں غم کی ہلکی ہلکی کسک پیدا ہو گئی ہے۔ انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی نور شاہ کے متنوع موضوعات میں شامل ہے بے گھاٹ کی ناؤ، من کا آنگن اُداس اُداس اور گیلے پتھروں کی مہک، جیسے کئی افسانے قابل قدر ہیں اور ہمارے افسانوی ادب میں اضافہ۔

حامدی ایک اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے کئی مجموعے، وادی کے پھول، برف میں آگ، سراب وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔ حامدی بنیادی طور پر شاعر ہیں۔ یہی شاعرانہ اسلوب ان کے افسانوں کی مانگ کا سیندور ہے۔ شروع میں ان کے یہاں ترقی پسند تحریک کا غیر واضح اثر جھلکتا ہے اور وہ سماجی مسائل کی طرف توجہ دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بعد میں انہوں نے اپنے شخصی تجربات کو افسانہ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی اور سماجی اقدار کی پامالی، رشتوں کی شکست و ریخت اور دوہری شخصیت کی نفسیات کے موضوع پر کئی کامیاب افسانے لکھے۔ اس ضمن میں ان کا افسانہ "لمحوں کا سفر" مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ حامدی جدیدیت کے رجحان سے متاثر ہیں اور ابتدائی دور کی رومانی اور سماجی کہانیوں سے داخلیت کے پیچیدہ رجحان تک ان کے یہاں کئی تجربے ملتے ہیں۔

اس دور کی دوسری اچھی کہانیوں میں برج کیتیال کے "موت سے راہی" مخمور بدخشی کی "نیل کمل مسکائے" "یہ خلش کہاں سے ہوتی" برج پریمی کی "ہنسی کی موت" سپنوں کی شام" "چلمن کے سایوں میں" امیش کول کی "دائرے" اور ہر کرشن کول کی کئی کہانیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کہانی کاروں کے یہاں بھرپور عصری شعور ملتا ہے۔ ان میں بہت سے افسانہ نگار اب تک مسلسل لکھ رہے ہیں۔ چنانچہ تیج بہادر بھان، کشمیری لال ذاکر، پشکر ناتھ، موہن یاور، برج پریمی، نور شاہ اور بہت سے دوسرے لوگ اردو افسانے کی آب یاری کر رہے ہیں اور فکر و شعور کی پختگی کے ساتھ نئے فنی تجربوں میں مشغول ہیں۔

۱۹۶۵ء کے آس پاس اردو میں نئے افسانے کی شروعات ہوتی ہے اور اب افسانہ نئی سمتوں کی طرف مڑنے لگتا ہے۔ نہ صرف موضوعاتی تازگی اور اسلوب کی شادابی کے لئے راہیں متعین ہونے لگتی ہیں۔ محسوس یہ ہوتا ہے کہ افسانہ زندگی کی بدلتی ہوئی کیفیتوں کو منعکس کر رہا ہے۔ زندگی میں جو اضطرار اور اضطراب پیدا ہوا ہے۔ اُسی سے افسانہ عبارت ہو گیا ہے۔ سائنس اور تیکنک کی تبدیلیوں نے جہاں دوسری تبدیلیاں پیدا کی ہیں وہاں عقائد ٹوٹ گئے ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن گیا ہے۔ زندگی کے مسایل سے نبرد آزمائی اور قدروں کی شکست و ریخت کی وجہ سے فنکار بھی خارج سے باطن کی طرف مراجعت کرنے لگ گیا ہے۔ اردو کا افسانہ آہستہ آہستہ عصری زندگی کے ان مسایل کو سمیٹتا ہوا روایت سے انحراف کرتا ہوا نئے علایم، تشبیہہ و استعارات کے سہارے سے آگے بڑھنے لگتا ہے۔ یہ خارجی اور معروضی سمتوں سے دامن بچاتا ہوا موضوعی، داخلی اور ذاتی بننے لگتا ہے اسلوب میں سادگی، سپاٹ پن، غیر مرصع اور غیر رنگین انداز پیدا ہونے لگتا ہے اور افسانہ تجریدی اور علامتی شکل اختیار کرنے لگتا ہے لیکن اس صورت حال کا

فوری ردعمل ہمارے یہاں نہیں ہوتا۔ یہ تبدیلیاں ابھی حالیہ برسوں میں ہمارے بعض افسانہ نگاروں کے یہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔

۱۹۶۰ء-۱۹۶۵ء کے بعد ہمارے یہاں نئے افسانہ نگاروں کا ایک کارواں جنم لیتا ہے۔ یہ لوگ جیسا کہ ذکر ہوا فوری طور پر جدیدیت کے میلان سے متاثر نہیں ہوتے البتہ دوسری قومی اور بین الاقوامی سیاسی، ثقافتی اور ادبی تحریکوں سے ضرور متاثر ہوتے ہیں۔ مارکسی واد اور فرائڈ کی جنسی نفسیات اور تحلیل نفسی کے اثرات تو بہت پہلے رونما ہوئے تھے۔ اب کھل کر سامنے آنے لگتے ہیں۔ لیکن ہند چینی سرحدی تنازعے کے باعث ترقی پسند تحریک کو جو دھچکہ ہندوستان میں لگا اس کے باعث ترقی پسند رجحانات ڈھیلے پڑنا شروع ہوئے البتہ جنسی نفسیات اور جنسی بے راہ روی کے موضوعات بطور خاص برتے جانے لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بعض یورپین ادبی میلانات راہ پانے لگے۔ نئے کہانی کاروں میں عمر مجید، کشوری منچندہ، وریندر پٹواری، شمس الدین شمیم، مالک رام آنند، او۔ پی۔ ساریتھی، الیش سروج، ڈی۔ کے کنول، امر المنوی، راجیش گوہر، کلدیپ رعنا، موتی لال کپور، جوتیشور پتھک، زماں آزردہ، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب باصلاحیت کہانی کار ہیں اور انہوں نے نہ صرف روایتی انداز کی کہانیاں لکھی ہیں بلکہ روایت سے انحراف کر کے نئے اور تازہ موضوعات کو اسلوب کی ندرت اور تازہ کاری سے اردو افسانے کو ترقی کی نئی سمتیں عطا کی ہیں۔ ان کے یہاں ہلکے پھلکے رومان بھی نظر آتے ہیں اور عصری زندگی کی زخمی تمنائیں بھی ملتی ہیں۔

اردو افسانہ ریاست میں کسی جمود کا شکار نہیں۔ یہاں کے کہانی کار اپنے خون جگر سے اسکی آبیاری کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں اور عصر حاضر کے انسان میں جو بے سروسامانی کرب اور تنہائی کا احساس پیدا ہوا ہے۔ اسکی ترجمانی جدید دور کے افسانہ نگار کر رہے ہیں۔ ان میں خاص طور پر آنند لہر، انیس ہمدانی،

غمگین غلام نبی، سوم ناتھ ڈوگرہ، راجہ نذر بونیاری، مسعود ساموں، جان محمد آزاد، فاروق رینزو نظیر نذر، زاہد مختار، کے ڈی مینی، اشرف آثاری، یاسین فردوسی، عبدالرشید فراق اور غلام رسول آزاد، واجدہ تبسم، وحشی سعید ساحل، اشوک پٹواری، مشتاق مہدی، زاہد مختار حمیداللہ وغیرہ کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ ان افسانہ نگاروں کے تجربوں میں وہ وسعت نہیں ہے جو انکے پیش روؤں میں موجود تھی لیکن انکے بعض افسانوں کو پڑھ کر یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کا مستقبل درخشاں ہے۔

ریاست میں اردو افسانہ مقابلتہً ایک کم سن صنف ہے اور اس بات کے باوصف کے یہاں کے کہانی کاروں کو اپنے افسانوں کی اشاعت کے سلسلے میں وہ سہولیات اور مواقع میسر نہیں ہوئے یہاں اردو افسانہ نگاری کے میدان میں جو کام ہوا ہے۔ وہ فنی لحاظ سے تیسرے درجے کی چیز نہیں ہے بلکہ بعض کہانیاں ایسی ہیں کہ انہیں بلا مبالغہ اردو کی بہترین کہانیوں کے ادب میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

جموں وکشمیر میں اردو نثر نگاری

ہماری ریاست میں اردو زبان کی عمر یہی کوئی سو سوا سو سال کے آس پاس ہو گی۔ سال ہا سال تک یہاں افغانوں اور سکھوں کی حکمرانی رہی اور یہاں کے لوگ غلامی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اس زمانہ میں فارسی زبان و ادب کا چلن رہا کشمیریوں نے اپنی ذہانت اور ذکاوت کا ثبوت فراہم کر کے اس زبان میں قابل قدر سرمایہ پیدا کیا۔ لیکن جب ڈوگرہ عہد کا آغاز ہوا اور مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶-۱۸۵۶ء) کو برطانوی مفادات کے تحفظ کے پیش نظر کشمیر کو خریدنے کا موقعہ فراہم کیا گیا اور ریاست جموں کشمیر کی حکومت قائم ہوئی تو سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر دہلی اور لاہور کی حکومتوں کے ساتھ تعلقات استوار ہوئے اور باہر آنے جانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ عام لوگوں کی سطح پر بھی بہ سلسلہ تجارت اور وسائل معاش کی تلاش کے باعث ان تعلقات میں اضافہ ہوا۔ اس اختلاط کا منطقی نتیجہ یہ ہوا کہ باہر جانے والے سیلانی اپنی فارسی دانی کے [illegible] حاصل کرنے میں

کامیاب ہوئے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ کشمیر کی آبادی کا خاصا حصہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران بعض سیاسی وجوہ سے ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ان میں سے اکثر خاندان وہیں کی خاک میں جذب ہو گئے اور اردو زبان کی تیز رفتار ترقی سے متاثر ہو کر انہوں نے شعر و ادب کے لیے نادر گل بوٹے سجائے جن کا اپنا الگ مقام ہے۔ ہم یہاں ان کارناموں سے بحث نہیں کرینگے۔

ڈوگرہ سلطنت کے بانی مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی لیکن جموں کے بیشتر علاقے کی زبان ڈوگری تھی جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے اس لئے اردو زبان اپنے ادبی خدوخال مرتب کرنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ - ۱۸۸۵) کا عہد مقابلتاً امن و سکون کا زمانہ تھا۔ مہاراجہ نے وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے علوم و فنون اور تعلیم کو اپنی ریاست میں رائج کرنے کے لیے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ لوگوں کو مغربی علوم و فنون سے آشنا کرنے کے لئے کافی دلچسپی کا اظہار کیا۔ لوگوں کو مغربی علوم و فنون سے آشنا کرنے کے لیے انگریزی تعلیم کے مدرسے قائم کئے۔ اپنے دربار میں عالم اور فاضل جمع کئے۔ ان میں سے بیشتر فارسی کے عالم تھے لیکن اردو زبان بولتے اور لکھتے تھے۔ مہاراجہ کا وزیر اعظم دیوان کرپا رام تھا۔ جو علاوہ انتظامی قابلیت کے علم و فن میں بھی دخل رکھتا تھا۔ وہ کئی فارسی کتابوں کا مصنف تھا۔ مہاراجہ کی حیات اور انتظام حکومت سے متعلق اس کی فارسی تصنیف "گلاب نامہ" آج بھی اہل نظر کی آنکھ کا سرمہ ہے۔ صوفی کے مطابق دیوان کرپا رام رنبیر سنگھ کے دربار کا ابوالفضل تھا۔ وہ فارسی کا ایک اچھا مصنف اور مورخ ہونے کے علاوہ اردو زبان میں بھی دست رس رکھتا تھا۔ اسکی وفات ۱۸۷۶ء میں ہوئی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ریاست کی انتظامی صورت حال پر رپورٹیں مرتب کرنا شروع کیں اور انکی اشاعت

کا اہتمام کیا۔ یہ رپورٹیں اردو میں مرتب کی جاتی تھیں۔ سال ۱۸۷۳-۷۴ کی رپورٹ کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"افسوس ہے کہ جب سے روز بروز اون پشموں کی تجارت میں افزائی ہوتی جاتی ہے۔ تجارت پشمینہ میں کساد و بے رونقی ہے چنانچہ نیلام ۱۸۷۲ء میں ایک روپیہ کے عوض آٹھ آنہ سے لیکر دس آنہ تک قیمت آئی دخریداران فرانس خریداری مال پشمینہ سست ہوا لہذا اکثر کارخانہ شال بافی بہ سبب کم ملنے قیمت پشمینہ کے خراب ہوئے۔"

اس نمونہ کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ زبان مقابلتہً صاف اور شستہ تھی۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس زمانہ تک آتے آتے اردو نثر کا اسلوب کافی نکھر گیا تھا۔ جس سے یہاں کے لکھے پڑھے لوگ آہستہ آہستہ متعارف ہو چکے تھے۔ سرسید کی تحریک کے بعد لاہور میں انجمن پنجاب کا بھرم اب بھی تھا لیکن اسمیں وہ دم خم نہیں رہا تھا۔ مدنظر رہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ نے جب حکومت کی عنان سنبھالی اور ابتدائی برسوں کی مشکلات کے بعد حکومت میں استحکام پیدا کیا تو اسے علم و ادب کی اشاعت کا خیال آیا۔ چنانچہ دوسرے کارناموں کے علاوہ اس نے جموں میں ایک سنسکرت کالج قایم کیا اور ایک شاندار لائبریری اور ایک دارالترجمے کا اہتمام کیا۔ اس دارالترجمے کے توسط سے سنسکرت اور فارسی کی کتابیں شایع ہوئیں اور بہت سے مسودات ڈوگری، ہندی اور اردو میں ترجمہ ہوئے۔ اس ادارے کے زیر اہتمام ریاستی نظم و نسق سے متعلق کئی رپورٹیں مرتب ہوئیں۔ ۱۸۸۲-۱۸۸۳ء کے دوران تیار کی ہوئی ایک رپورٹ درج ذیل ہے:۔

"۵۰۲۴ روپیہ اجرت ترجمہ اس سال میں صرف ہوا اور اس سال میں کوئی کتاب جو انگریزی سے شائع ہوتی

اور شاستری بھاشا اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئی

ہیں، ختم ہوئی ہیں"۔

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کی کتابیں جو عربی یا دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل ہوئی تھیں ان کو باضابطہ طور پر شائع کیا جاتا تھا اور اسکی کھپت ہوئی تھی اس عہد کے کئی مسودات ملتے ہیں جن میں سے اکثر انگریزی فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمہ ہوئے ہیں اور ساتھ ساتھ دیوناگری حروف میں بھی لکھے گئے ہیں۔ ان مسودات کی تیاری میں غلام غوث خان، پنڈت کشی رام مولوی افضل الدین لالہ لبنت رائے کے نام قابل ذکر ہیں یہ لوگ مہاراجہ کے دربار کے ساتھ منسلک تھے اور انہوں نے طب انجینرنگ، منطق تاریخ، مذہب، کاغذسازی، اناٹومی وغیرہ سے متعلق مسودات تیار کیے۔ انکے مسودات میں زبان کا اسلوب صاف ستھرا ہے۔ کہیں کہیں ادبی چاشنی ملتی ہے۔ جہاں کہیں انگریزی اصطلاحات کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ وہاں ان کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ مہاراجہ رنبیر سنگھ کے عہد میں ابھی اردو زبان کو ریاست کی سرکاری زبان ہونے کا منصب عطا نہیں ہوا تھا۔ لیکن زبان عام پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہو رہی تھی۔ چنانچہ دارالترجمہ کے دائرہ عمل سے باہر بھی کئی نثری کارنامے وجود میں آئے۔ مہتہ شیر سنگھ نے ۱۸۶۶ء-۱۸۶۷ء کے دوران ایک سفرنامہ لکھا۔ یہ سفرنامہ پڑوسی ممالک کے ساتھ تجارتی تعلقات کو استوار کرنے کے پیش نظر لکھا گیا تھا۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے کارناموں میں "بدیا بلاس پریس" کا قیام بھی شامل ہے۔ جو ۱۸۸۲ء میں عمل میں لایا گیا۔ یہ ریاست کا پہلا پریس تھا۔ اسی سال ریاست کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" سرکاری گزٹ کے طور پر جاری کیا گیا۔ یہ اخبار اردو اور ہندی دونوں

حروف میں شایع ہوتا تھا۔ اس عہد کے اہم ادیبوں میں ہرگوپال خستہ کا نام سرِ فہرست ہے۔ خستہ، شبلیؔ اور حالیؔ کے معاصر تھے وہ کشمیری الاصل تھے اور سال ہا سال ریاست سے باہر لاہور اور پٹیالہ میں رہ چکے تھے۔ قیام لاہور کے دوران وہ "راوی" "ریفارمر" "خیر خواہ کشمیر" "دیش کی پکار" اور اس قبیل کے کئی پرچوں کے ساتھ وابستہ رہ چکے تھے۔ لاہور میں ان کا تعارف پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات کرنل ہالرائیڈ کے ساتھ ہو چکا تھا۔ وہ انجمن پنجاب کی کارکردگیوں سے بھی واقف تھے۔ اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ اپنے عہد کے نئے خیالات اور تصورات سے واقف تھے بلکہ اردو زبان کے مزاج سے بھی واقف تھے۔ خستہ اعلیٰ پایہ کے شاعر اور نثر نگار تھے۔ وہ ۱۸۷۶ء میں کشمیر لوٹے اور آتے ہی اپنی خداداد قابلیت کی وجہ سے مہاراجہ رنبیر سنگھ کے دربار کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔

خستہ کے کئی نثری کارنامے ہیں۔ ان کی "گلدستۂ کشمیر" اردو نثر میں غالباً کشمیر کی پہلی تاریخ ہے۔ جو عہد قدیم سے لیکر مہاراجہ پرتاب سنگھ کے عہد کا احاطہ کرتی ہے یہ کتاب ۱۸۸۳ء میں لاہور سے شایع ہوئی۔ خستہ رنبیر سنگھ کے عہد کے چشم دید گواہ تھے۔ اس لئے تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ کتاب نہایت شستہ اور صاف ستھری زبان میں لکھی گئی ہے اور اس ثقالت سے پاک ہے جو اس سے قبل کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ اردو کے نثری شعبے میں یہ قابل قدر کارنامہ ہے خستہ کی دوسری تصنیف رسالہ "گلزار فوائد" ہے۔ یہ دراصل ایک قصہ ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد کے مراۃ العروس کا تتبع کیا گیا ہے۔ اسلوب سلیس اور واضح ہے۔ کہیں کہیں مقفیٰ اور مسجع عبارت کا التزام کیا گیا ہے۔ خستہ کے کارناموں میں انکے انشائیے بھی شامل ہیں۔

مہاراجہ رنبیر سنگھ کے انتقال کے بعد مہاراجہ پرتاب سنگھ ۱۸۸۵ء میں تخت

نشین ہوئے اس عہد تک اردو پڑھے لکھے لوگوں کا حلقہ بڑھ گیا تھا اور اردو زبان ذریعہ اظہار بن گئی تھی۔ مہاراجہ نے اس زبان کی مقبولیت کے پیش نظر ۱۸۸۹ء میں اسے سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کرلیا۔ سرکاری سرپرستی حاصل ہوتے ہی یہ زبان ریاست کی سماجی اور سیاسی زندگی میں اپنا شاندار رول ادا کرنے لگی اور تعلیمی اداروں سرکاری محکموں اور عدالتوں میں استعمال ہونے لگی۔

ہر گوپال کول خستہ کے بھائی سالگ رام کول سالک اس عہد کے دوسرے اہم نثر نگار ہیں۔ سالک کا ادبی ذوق بھی لاہور کی ادبی فضاؤں میں پروان چڑھا تھا۔ کافی عرصہ تک "اودھ اخبار" لکھنؤ میں مضامین لکھتے رہے۔ انہوں نے خود بھی لاہور سے "خیر خواہ کشمیر" نام کا ایک ہفت روزہ جاری کیا تھا۔ اسی عہد میں عیسائی مشنریوں اور مبلغوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔ مغربی خیالات کی توسیع ہونے سے اور عیسائیت کی تبلیغ کو روکنے کے لئے مختلف مذاہب کے پڑھے لکھے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوئی آریہ سماج نے بھی اپنی سرگرمیاں تیز تر کرلیں۔ سالک نے مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی سرپرستی میں سناتن دھرم سبھا کا کام سنبھالا۔ آریہ سماجی پرچار کے خلاف اور سناتن دھرم کی حمایت میں کئی کتابچے لکھے اور شایع کروائے۔ "ان میں" مورتی منڈن" "دھرم اپدیش" اور شاستر ارتھ قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ "لغات اردو" اور "محاورات اردو" کے نام سے دو چھوٹی کتابیں مرتب کیں۔ سالک نے کئی قانونی کتابیں بھی مرتب کیں۔ "رنبیر ڈنڈ بدھی" (قانون تعزیرات جموں وکشمیر) کی مبسوط شرح اس ضمن میں ان کا خاص کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مجموعہ ضابطہ دیوانی قانون رجسٹری اور دوسری قانونی دستاویزات کی شرح بھی لکھی۔ سالک نے اردو کتابوں کی اشاعت کے لئے ایک پریس بھی قائم کیا تھا۔ جس کا نام "سالگرام پریس" تھا۔ اور گلاب سنگھ کی حیات کا ترجمہ بھی اسی زمانے میں کیا۔ خالص ادبی کارناموں میں ایک اچھی تصنیف "گنجینۂ فطرت" یا

مناظر فطرت" کے نام سے شائع ہوئی ہے فطری سلیس دل کش اور رواں اسلوب میں یہ اپنی طرز کے انشایئے ہیں جن میں کشمیر کے مناظر کو بیان کیا گیا ہے۔ سالک کا ایک اور کارنامہ" داستان جگت روپ" ہے جو کسی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ یہ کتاب قصہ کے پیرائے میں لکھی گئی ہے۔ "تحفہ سالک" ایک سفرنامہ ہے جس میں دوسرے ممالک کی تواریخ اور جغرافیہ کا سہارا لیکر وہاں کی ترقی کا حال لکھا گیا ہے۔ اس کتاب میں قصے کی تکنیک کا التزام کیا گیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں لاہور اور دوسری جگہوں سے ریاست کا رابطہ اخبارات کے ذریعے قائم ہوا۔ ان اخبارات میں ریاست کے سیاسی سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین شائع ہونے لگے۔ جس سے یہاں کے پڑھے لکھے لوگوں میں صحافت سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور لکھنے والوں کی صلاحیت کو ابھرنے کا موقعہ دستیاب ہوا۔ محمد دین فوق کی مساعی اس ضمن میں سب سے نمایاں ہے۔ فوق نے لاہور اور کشمیر سے مختلف اخبارات جاری کئے اور اپنے قلم کی تمام توانائیوں کے ساتھ اہل کشمیر کو غفلت کی نیند سے بیدار کرنے کا کارنامہ انجام دیا۔ فوق ایک عظیم مورخ صحافی تذکرہ نگار اور نثر نگار تھے۔ انہوں نے متنوع موضوعات پر قلم اٹھایا وہ بہت زود نویس بھی تھے اور درجن بھر اخبارات اور رسائل کے ساتھ وابستہ رہے۔ ناول، افسانہ، سوانح، تذکرہ، تاریخ کے شعبوں میں ان کے متعدد نثری کارنامے موجود ہیں وہ اپنے عہد کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔ ان کی تصانیف میں تاریخی کتابوں، تذکروں، ناولوں، ڈراموں اور دوسرے نثری کارناموں کی تعداد لگ بھگ سو تک جا پہنچی ہے۔ فوق کشمیر کا وہ جیالا سپوت تھا جس نے کشمیر میں اور کشمیر سے باہر کشمیر کی صحیح ترجمانی کرنا اپنا ایمان سمجھا اور نہایت ہی شستہ اور سلیس انداز میں کشمیر کے ماضی سے بیرون کشمیر کے لوگوں کو روشناس کرانے کے لئے قلم کا سہارا لیا [illegible] کے اوائل میں اردو دنیا

میں دھوم مچا دی۔

اس دور میں انجمن نصرت الاسلام، انجمن مرزایاں اور انجمن شرعی شعیان کی طرف سے بھی اردو میں دینی مسائل پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ان کتابوں اور رسائل کے علاوہ عیسائی مشنریوں نے مسیحیت اور دیگر مباحث کا احاطہ کیا۔ ان کی تفصیل ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہے۔

۱۹۲۴ء میں لالہ ملک راج صراف نے ریاست کا پہلا اخبار جموں سے جاری کیا۔ اس اخبار کی اشاعت نے اردو نثر کی توسیع اور ترقی کے لیے راہیں کھول دیں اور نئی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس طرح سے نئے نثر نگاروں کا ایک بڑا حلقہ پیدا ہوا۔ ان میں مولوی زین العابدین (مہذب کسان) سالگرام کول، جیالال کلم، مولوی عبداللہ وکیل، پریم ناتھ بزاز، کشپ بندھو، پریم ناتھ رونق، بدیو پرشاد شرما، عشرت کشتواڑی، نشاط کشتواڑی، دیاکرشن گردش، غلام حیدر چشتی، قیس شیروانی، تاراچند ترسل سالک کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان میں بعض لوگ لاہور کے اخبارات کے لئے بھی لکھتے تھے۔ لیکن رنبیر نے ان کی صلاحیتوں کو ابھارا اور پنپنے کا موقع فراہم کیا۔

سرینگر کا پہلا اخبار "وتستا" پریم ناتھ بزاز کی ادارت میں ۱۹۲۳ء میں شایع ہوا اور اس کے بعد بزاز صاحب اور شیخ محمد عبداللہ نے ۱۹۲۵ میں "ہمدرد" شایع کیا۔ "ہمدرد" ریاست کا پہلا مصور ہفت روزہ تھا۔ اسی سال کشمیری پنڈتوں کی انجمن کے پرچے "مارتنڈ" کا اجرا بھی ہوا۔ ان اخبارات نے صحافت کا ایک نیا معیار قایم کیا اور شمالی ہندوستان کی اخباری دنیا میں دھوم مچا دی۔ یہی وہ اخبار ہیں جن کے ضخیم سالناموں اور خاص نمبروں نے یہاں کے تخلیقی فن کاروں کو اردو دنیا میں متعارف کیا۔ خاص قلمکاروں میں جنہوں نے نثر کے مختلف شعبوں میں قلم چلایا۔ پردیسی، دیناناتھ وارث، کوشاہد، نیاز کامراجی، انور بریمی، وشوناتھ ماہ، آنند کول بامزئی،

نند لال بے غرض، علامہ کشفی، تیرتھ کاشمیری، شیام لال ایمیہ، علامہ مہجور قابل ذکر ہیں۔

ان ادیبوں نے اپنی تمام فنی بصیرت کے ساتھ ریاست کی فکری اور معاشرتی زندگی کے پہلوؤں کی ترجمانی کی۔ اس دور کی اہم تصانیف میں پریم ناتھ بزاز کی "کشمیر کا گاندھی" (شیخ محمد عبداللہ کی سوانح حیات) تیرتھ کاشمیری کی دیوتا (نتری بھٹ کی سوانح) وشوا ناتھ درماہ کی "تلاش حقیقت" اور انکشاف حقیقت (فلسفہ اخلاق) اور سروانند چراغی اور آفتاب کول وانچو کی چند چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں۔

فکشن

ریاست میں نثر کے اس شعبے کی طرف غالباً فوق مرحوم نے سب سے پہلے توجہ کی اور کچھ تاریخی اور نیم تاریخی قصے لکھے۔ اس کے بعد چراغ حسن حسرت کا افسانوی مجموعہ کیلے کا چھلکا اور دیگر افسانے" (۱۹۲۷ء) میں لاہور سے شائع ہوا۔ لیکن اس صنف میں باضابطہ اور باقاعدہ طور پر پریم ناتھ پردیسی نے رنگ بھر دیا۔ ان کے چراغ سے بعد کے تخلیق کاروں نے چراغ روشن کیے۔ پردیسی کی ابتدائی کہانیاں بچوں کے ماہنامے "رتن" جموں میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی دلچسپ اور نصیحت آمیز کہانیاں ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے میں ٹیگور کے ادب لطیف اور نثری شاعری کے ترجموں نے زبان و بیان کا جادو جگایا تھا اور سدرشن، یلدرم، نیاز اور پریم چند کے افسانوں نے دھوم مچائی تھی۔ پردیسی اسی فضا میں پروان چڑھے۔ انہوں نے ابتدا شاعری سے کی لیکن ۱۹۳۲ء سے نثر کی طرف توجہ کی۔ شروع شروع میں ان کی نثر میں ٹیگور کا رومانی اسلوب اور ادب لطیف کا اثر جھلکنے لگا لیکن پھر پریم چند کی "کفن" اور انگارے کے افسانوں کی اشاعت نے ان کا ذہن مکمل طور سے بدل دیا اور وہ ۱۹۳۸ء کے بعد حقیقت آمیز ادب کی تخلیق میں مصروف ہوئے اس زمانے میں ہماری تحریک آزادی نے نیا موڑ لیا تھا

اور پردیسی ایک حساس فنکار کی طرح اس واضح حقیقت سے دامن بچا نہ سکے۔ انہوں نے مختلف فرضی ناموں سے بھی کہانیاں لکھیں اور اپنے فن کو جذباتیت اور رومانیت کے حسین سراب سے نکال کر زندگی کے خارزار میں پہنچا دیا اور صحیح معنوں میں اہلِ کشمیر کے جذبات کی ترجمانی کی جہاں صرف حسن ہی نہیں تھا بلکہ اس کے دبیز پردوں کے پیچھے بھوک بیکاری اور غلامی کے رستے ہوئے ناسور تھے۔ پردیسی کے اہم کارنامے افسانوں کے مجموعے 'شام و سحر' 'دنیا ہماری' 'بہتے چراغ'۔ بچوں کے لئے 'چند کتابیں' 'چور نگی' 'چار بیٹے' 'جان بازبچے' کرنیں اور ایک ناول "پونی" ہیں۔ پردیسی ریاست کے بڑے قد کے افسانہ نگار تھے اور ان کا شمار ملک کے صف اول کے اردو افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے وہ ہماری ریاست کے پہلے فن کار تھے جو کہانی سننے اور کہانی کہنے کا گر جانتے تھے۔ بیان کے اختصار لہجے کی چستی اور موضوع کی صداقت پر ان کے فن کی عمارت کھڑی ہے۔ پردیسی کے معاصرین میں دوسرے بڑے افسانہ نگار پریم ناتھ در ہیں۔ وہ پردیسی سے ذرا دیر کے بعد آئے۔ در کے یہاں کشمیری زندگی کی صحیح نمائندگی نظر آتی ہے۔ در کے اسلوب کی خاص خصوصیت ان کی زبان کا برتاؤ ہے۔ ان کے یہاں مافی الضمیر کے اظہار کے لئے تشبیہات' استعارات اور تراکیب کی ایسی ندرت ملتی ہے۔ جہاں وہ پردیسی سے چند قدم آگے نظر آتے ہیں۔ 'کاغذ کا واسدیو' اور 'نیلی آنکھیں' نام کے مجموعے اردو کے افسانوی ادب میں اپنا مقام رکھتے ہیں اس دور میں کئی اور نام ابھرے نرسنگھ داس نرگس جو سال ہا سال تک مولا رام کوٹی کے فرضی نام سے لکھتے رہے اچھے افسانہ نگار تھے۔ ان کے کئی مجموعے مثلاً "دکھیا سنسار" "سندیسہ" وغیرہ اسی صدی کے چوتھے دہے میں شائع ہوئے۔ نرگس کے یہاں ایک نئے انداز میں جاگیر دارانہ نظام کے جبر و استبداد اور طبقاتی کشمکش کی تصویر ملتی ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں میں محجوبہ یاسین' عزیز پرکاش' انگر عسکری' کوثر سیمابی' موہن یاور' گلزار احمد فدا' کشمیری لال ذاکر' جگدیش کنول' کیف اسرائیلی'

ٹھاکر پونچھی، عبدالعزیز علائی، غلام حیدر چشتی، نند لال بے غرض، دینا ناتھ وار یکو، شاہد، شیام لال ایمہ، تیرتھ کاشمیری، گنگا دھر بٹ دیہاتی، محمود ہاشمی، حمید نظامی، کاشی ناتھ ایمہ کنول، ویرو شیشور وغیرہ بیسوں فن کار قابل ذکر ہیں۔ ان میں کئی لوگوں کے مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ تقسیم کے بعد کئی ادیب پاکستان چلے گئے، جن میں قدرت اللہ شہاب، حبیب کیفوی، احمد شمیم، کیف اسرائیلی، عزیز کاشش، محمد عمر، کوثر سیمابی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد کئی اور نام ابھرے۔ سوم ناتھ زتشی، علی محمد لون، اختر محی الدین، بنسی نردوش، یہ لوگ پہلے اردو میں لکھتے تھے۔ تیج بہادر بھان، پشکر ناتھ، حامدی کاشمیری، دیپک کول، برج پریمی، ہری کرشن کول، محمود بدخشی، ویدراہی، زیڈ ہیمی، اشیش کول اور دوسری نسل میں شبنم قیوم، ریاض پنجابی، عمر مجید، او، پی، سارتھی، کالی پد رعنا، کشوری منچندہ، عبدالغنی لداخی، جوگیشور ستھپک، ظہور الدین، بشیر شاہ، امر مالموہی، ویریندر پٹواری، شمس الدین شمیم، محمد زمان آزردہ، ڈی کے کنول، مالک رام آنند، آنندلہر، رام کمار ابرول، ٹیش سروج اور کئی چھوٹے بڑے نام ابھرے ہیں۔ یہ لوگ ریاست میں اردو فکشن کی آبرو ہیں۔ ان میں سے بعض لوگوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ یہ فن کار نہ صرف یہ کہ کہانی کے فن سے واقف ہیں بلکہ وقت کے تقاضوں کے پیش نظر اپنے فن کو ڈھالتے رہے ہیں۔ رومانی دور ہو یا ترقی پسندی کا دور یا عصر حاضر کے تقاضے ہوں ان کے یہاں بدلتے ہوئے رجحانات کی بھرپور ترجمانی نظر آتی ہے۔ اسالیب اور ہیئت کے نئے تجربوں سے ان کا فن عبارت ہے۔ جدید اردو ادب میں ان میں سے بیشتر لوگ ملکی سطح پر اپنی فن کارانہ حیثیت منوا چکے ہیں۔

ناول نگاروں میں فوق مرحوم کے بعد پہلا نام نند لال بے غرض کا ہے۔ جنہوں نے سرشار کے اسلوب میں لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کے ناول "تازیانہ عبرت" میں فسانہ آزاد کا تتبع نظر آتا ہے۔ پریم ناتھ پردیسی نے بھی "بہتی" نام کا ایک ناول لکھا تھا جو

۱۹۴۷ء کی افراط و تفریط میں تلف ہوگیا۔ رامانند ساگر کا ناول "اور انسان مرگیا" فسادات کے موضوع پر اپنے عہد کا اہم ناول ہے جو عرصۂ دراز تک برصغیر کے ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا رہا۔ ساگر نے اپنے ناول کو سرینگر کی ترقی پسند مصنفین کی انجمن میں باقسط وار پڑھا تھا۔ تقسیم کے بعد کشمیری لال ذاکر، ٹھاکر پونچھی، علی محمد لون، تیج بہادر بھان، نور شاہ، حامدی کاشمیری، غلام رسول سنتوش، صوفی محی الدین، جان محمد آزاد، فاروق رینزو، اور بعض دوسرے لوگوں نے اچھے ناول لکھے۔

ڈراما کی صنف میں بھی اچھا کام ہوا ہے۔ محمد عمر نور الٰہی کی کتاب ناٹک ساگر اردو کے ڈرامائی ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دینا ناتھ وار یکو کا ڈراما "رکمنی ہرن" ۱۹۳۳ء میں ہمدرد سرینگر میں قسط وار شایع ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد محمود ہاشمی، پردیسی لون، رتن لال شانت، پشکر، موہن یاور، شکیل الرحمن، وجے سوری، حامدی، آفاق، وید راہی، دیریندر پٹواری، بشیر شاہ اور کئی دوسرے لوگوں نے اچھے ڈرامے لکھے۔ ان سب ادیبوں نے تجربے کی گہرائی اور مشاہدے کی صداقت کو بروئے کار لاکر کشمیر کی سیاسی، سماجی، فکری اور تہذیبی زندگی کے اہم پہلوؤں کی عکاسی کی۔

تحقیق و تنقید

عبدالاحد آزاد ہمارے پہلے محقق اور ناقد ہیں۔ آزاد نے ۱۹۳۵ء میں حیات مہجور کے عنوان سے ایک چھوٹا سا مقالہ لکھنا شروع کیا۔ لیکن ان کے ذوقِ جستجو نے اس کام کو کافی پھیلا دیا۔ حتیٰ کہ ایک کافی ضخیم مسودہ تیار کرلیا۔ یہ مقالہ ۱۹۵۹ء میں پہلی بار کلچرل اکادمی کے اہتمام سے "کشمیری زبان اور شاعری" کے عنوان سے تین جلدوں میں شایع ہوا۔ آزاد اگرچہ کم تعلیم یافتہ تھے مگر ان میں کھوج، تحقیق اور تجسس کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں جب کشمیر میں رسل و رسائل کے موزوں ذرایع نہیں

نھے آزاد مہینوں دور دراز دیہاتوں میں گھومتے رہے اور بڑی جگر کاوی سے مواد اکٹھا کرلیا۔ "کشمیری زبان اور شاعری" جیسا کہ نام سے ظاہر ہے کشمیری زبان کی شاعری سے متعلق تحقیقی کارنامہ ہے لیکن اسے اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ آزاد نے اس موضوع پر سب سے پہلے قلم اٹھایا اور طرز نگارش کی شائستگی اور محققانہ جگر کاوی کے ساتھ یہ کتاب مرتب کرلی۔ اس قابل قدر تصنیف میں علاوہ اور باتوں کے مصنف کا تنقیدی شعور اور استدلالانہ انداز متاثر کرتا ہے آزاد پہلے محقق اور ناقد ہیں جنہوں نے کشمیری شاعری کے تدریجی ارتقاء کے علاوہ تصوف اور فلسفے کے مسائل اور رومانیت کے مباحث اٹھائے اور ان پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اگر زندگی یارا کرتی تو آزاد اور کئی کارنامے انجام دیتے۔

نند لال طالب اردو کے بلند مقام شاعر تھے۔ لیکن تحقیق و تنقید میں ان کا کارنامہ "جوہر آئینہ" ایک اہم کام ہے۔ طالب نے بڑے سلجھے ہوئے عالمانہ اور غیر جذباتی انداز میں غالب پر ایک اچھا کارنامہ انجام دیا۔ غلام حیدر چشتی کی "اصلاح ادب" اور ڈاکٹر سدھیشور ورما کی لسانیات سے متعلق تصنیف اس دور کے بہت اہم کارنامے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے ناقدوں میں ڈاکٹر حبیب اللہ حامدی کاشمیری کا نام سر فہرست ہے۔ حامدی شعر افسانے، ناول، ڈرامے تمام اصناف پر اپنا قلم آزما چکے ہیں اور ان میں اپنا لوہا منوا چکے ہیں۔ لیکن ادھر چند برسوں سے انہوں نے تحقیق و تنقید کو اپنا خاص موضوع بنایا ہے "جدید اردو نظم اور یورپی اثرات" "غالب کے تخلیقی سرچشمے" "اردو شاعری اور عصری حسیت" "کارگہہ شیشہ گری" "غالب اور اقبال" "ناصر کاظمی کی شاعری" "امکانات" وغیرہ اس شعبے میں ان کے اہم کارنامے ہیں۔ حامدی اردو کی جدید تنقید میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری ریاست کے ایک اور محقق ہیں جنہوں نے اردو کی کلاسیکی شاعری

کے کئی پہلوؤں کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان کا خاص موضوع اردو مرثیہ ہے۔ اکبر حیدری صاحب نے ایک اچھے محقق کا فرض نبھایا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ان کی تصانیف میں میر انیسؔ بحیثیت رزمیہ شاعر تحقیق و انتقاد مطالعہ زور، تحقیقی جائزے، دیوان میر، اودھ میں مرثیہ نگاری کا ارتقاد، تحقیقی نوادر، تحقیقات حیدری، اہم ہیں۔

محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ النظر نقاد ہیں۔ اردو اور کشمیری ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں اور بہت سے عالمانہ تنقیدی اور تحقیقی مقالے لکھ چکے ہیں۔ جو ایک نئی سوچ و فکر کا آئینہ ہیں۔ دوسرے نقادوں اور محققوں میں پروفیسر لشپ، رحمان راہی، کاشی ناتھ پنڈتا، شمس الدین احمد، شمیم احمد شمیم، امین کامل، محمد عبداللہ شیدا، غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، مولوی محمد ابراہیم، موتی لال ساقی، بدیو پرشاد شرما، مشعل سلطانپوری، برج پریمی، رشید نازکی، نشاط انصاری، مرغوب بانہالی، محمد زمان آزردہ، ظہور الدین، عبدالغنی لداخی، سیف الدین سوز، نذیر احمد ملک، اسداللہ وانی، ارجن دیو مجبور، عبدالاحد رفیق، پریمی رومانی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے ادب تہذیب اور تمدن کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے ہیں جو نہ صرف ان کی وسعت نظری پر دال ہیں بلکہ جن میں اسالیب کی رنگارنگی بھی نظر آتی ہے۔

صحافت

ریاست میں اردو نثر کی اشاعت و ترویج میں اخبارات اور رسائل کا رول سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۴ء تک ریاست کے بہت سے لوگوں نے ریاست سے باہر لاہور، دہلی، الہ آباد اور دوسرے شہروں سے اخبارات جاری کئے۔ ان اخباروں میں خاص طور پر ریاست کی سیاسی، سماجی اور معاشرتی مسایل پر مضامین لکھے جاتے تھے۔ چند اخباروں کے نام یوں ہیں۔

۱۔ مراسلہ کشمیر لاہور	۱۸۸۰
۲۔ اخبار عام لاہور	۱۸۸۱
۳۔ خیر خواہ کشمیر لاہور	۱۸۸۲
۴۔ کشمیر درپن الہ آباد	۱۸۹۸
۵۔ کشمیر گزٹ لاہور	۱۹۰۱
۶۔ کشمیر میگزین لاہور	۱۹۰۶
۷۔ بہار کشمیر لاہور	۱۹۱۶
۸۔ صبح کشمیر لاہور	۱۹۱۶

ریاست سے ایک اردو اخبار نکالنے کی اولین کوشش سالگ رام سالک نے ۱۸۸۰ء میں کی تھی لیکن اس زمانہ میں اخبار کی بات کرنا بھی بغاوت کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے سالک واپس لاہور چلے گئے اور وہیں ۱۸۸۲ء میں "خیر خواہ کشمیر" نکالا۔ لیکن چند برسوں کے بعد مہاراجہ رنبیر سنگھ نے خود ریاست کا پہلا اخبار "بدیا بلاس" کے نام سے جاری کرنے کا حکم دیا۔ یہ اخبار ہندی اور اردو دونوں حروف میں شائع ہوتا تھا لیکن اس میں صرف سرکاری کارگزاری کی اشاعت ہوتی تھی۔ مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے زمانہ میں ریاست سے اخبار نکالنے کی بہت کوشش ہوئی۔ ۱۹۰۴ء میں محمد الدین فوق نے بھی اس مقصد کے لئے مہاراجہ کے سامنے درخواست پیش کی تھی لیکن انہیں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ آخر یہ کوششیں ۱۹۲۴ء میں رنگ لائیں۔ یہ سہرا ریاست کے مشہور صحافی لالہ ملک راج آنند کے سر باندھا جا سکتا ہے اس طرح سے "رنبیر" نے جنم لیا۔ لالہ جی نے اخبار کے ساتھ ساتھ ایک پریس بھی کھولا۔ ان اقدامات سے اردو کی اشاعت کی فضا ساز گار بن گئی۔ یہ اخبار ۲۶ سال تک اردو کی خدمت کرتا رہا اور اس نے بے شمار نثر نگار پیدا کئے۔ لالہ ملک راج صراف نے ۱۹۲۴ء میں بچوں کے ایک رسالے ماہنامہ "رتن" کا اجراء کیا۔ یہ اقدام فعال ثابت ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس رسالے نے ہندوستان

گیر شہرت حاصل کی۔ یہ رسالہ شمالی ہندوستان کے بچوں کے رسالوں میں سب سے اہم مقام رکھتا ہے۔ اس نے بچوں کے ادب کا ایک نیا معیار قائم کیا۔ لاہور کے پھول[1] کے سوائے اس کی ٹکر کا کوئی اور رسالہ اس زمانے میں نہیں تھا۔

رنبیر کے بعد سال ہا سال تک ریاست سے کوئی اخبار جاری نہ ہوسکا لوگوں کو اس حبس میں دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے پیش نظر مہاراجہ ہری سنگھ کے سیاسی مشیر سر البین بنیر جی یہ کہتے ہوئے مستعفی ہوئے کہ "ریاست میں کوئی رائے عامہ نہیں۔ پریس عنقا ہے اور تعمیری تنقید کے ذریعے سے سرکار کے پاس استفادہ کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں" اور ۱۹۳۱ء کی مڈلٹن کمیشن رپورٹ میں درج کیا گیا کہ "ریاستی مسلمانوں کی بے چینی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ریاست میں اخبار شائع نہیں ہوتے" اس دباؤ سے پریس ایکٹ میں ترمیم ہوئی۔ ۱۹۳۲ء سے باضابطہ طور پر اخبارات کا اجرا شروع ہوا اور ۱۹۴۷ء تک اخبارات کی تعداد ۴۰ تک پہنچ گئی۔ چند قابل ذکر اخبارات یہ ہیں۔ دیش، کیسری، خدمت، حقیقت، صداقت، نور، رہنما، جیوتی، نوجیون، وکیل، خالد، آفتاب، سرینگر ٹائمز، آئینہ، اقبال، ہمارا استاد، لوائے صبح وغیرہ سرینگر سے اور جموں سے امر، سویرا، سچ، کشمیر میل، وطن، پاسبان، حقیقت، سُدرشن، چاند، افتاد، خورشید، کشمیر ٹائمز، اسی طرح پونچھ، میرپور اور مظفر آباد سے بھی اخبارات شائع ہوئے۔ ریاست کے صحافیوں میں ملک راج آنند، مولانا محمد سعید مسعودی، کشپ بندھو، علامہ کشفی، پریم ناتھ بزاز، پریم ناتھ کنہ، نند لال واتل، قیس شیروانی، نرسنگھ داس نرگس، دیا کرشن، ثناء اللہ بٹ، صوفی غلام محمد، شمیم احمد شمیم، غلام نبی خیال، گردش، موتی لال مصری، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جنہوں نے ریاست میں اردو صحافت کو ایک نیا معیار عطا کیا۔

رسائل میں "پریم" اور "فردوس" جموں ذکر کے قابل ہیں۔ "پریم" نرسنگھ داس نرگس

---

[1] پھول ہفت روزہ تھا۔ (پ۔پ)

نکالتے تھے اور فردوس کی ادارت قیس شیروانی اور کشمیری لال ذاکر کے ذمے تھی۔ (فردوس میں پریم چند اور ان کی اہلیہ شیورانی دیوی کی کہانیاں بھی چھپتی تھیں) ۱۹۴۷ء کے بعد رسایل کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ محکمہ اطلاعات نے ظفر پیامی کی ادارت میں "تعمیر" نکالا۔ جموں سے دیدراہی نے "سویرا" موہن یاور نے "سنگم" اور نند گوپال باوا نے "نوری چیم" شروع کیا۔ محکمہ دیہات سدھار کا رسالہ "دیہات سدھار" باقاعدگی سے شایع ہونے لگا۔ اس کے علاوہ کلچرل کانفرنس نے "کونگ پوش اور آزاد" نکالا۔ جیوتی، وکیل، ہما، جھرنا، کینواس، دلیش، جموں، پروگریسو رائیٹرس ایسوسی ایشن کا "ادبیات" شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کا "نیا شعور" "ادبیات" اور "بازیافت" کشمیر یونیورسٹی کے اقبال انسٹی ٹیوٹ کا مجلہ اقبالیات، اور شعبہ فارسی کا مجلہ دانش، بھی قابل ذکر ہیں۔ مقامی کالجوں کے رسائل میں پرتاب، لالہ رخ، توی، زون، پمپوش بھی اہم ہیں۔ محکمہ تعلیم کا تعلیمی اور تدریسی مجلہ تعلیم جدید پیرزادہ غلام رسول اور غلام رسول ناز کی نکالتے رہے۔ یہ پرچہ خواجہ غلام السیدین ناظم تعلیمات کی نگرانی میں باقاعدہ چھپتا تھا۔ مرحوم شمیم احمد شمیم نے "تعمیر" کو ایک نئی جہت عطا کی اور اسے ملک کے اردو داں طبقے میں روشناس کیا۔ ٹیچرس ایسوسی ایشن کا "استاد" اور "ہمارا استاد" کافی عرصہ تک چھپتا رہا۔ اس طرح اردو نثر کے امکانات ریاست میں روشن کئے۔ اردو شعروادب کی اشاعت میں کلچرل اکادمی کی مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے اہتمام سے چھپنے والے شیرازہ اور ہمارا ادب نے گزشتہ برسوں میں کئی نمبر شایع کئے۔ جن کی دستاویزی اہمیت ہے۔

ادبی انجمنیں

اردو نثر کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ادبی انجمنوں کا ذکر ناگزیر ہے۔ جب

اخبارات اور رسایل شایع ہونے لگے تو یہاں کے اہلِ قلم حضرات نے اپنے احساسات کا اظہار اردو نثر اور شعر میں کرنا شروع کیا۔ باہر کے تخلیق کاروں کا ادب یہاں پہنچا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور جب ریاست سے باہر کے سربرآوردہ ادیبوں اور شاعروں نے یہاں آنا شروع کیا تو بہتر تے ہوئے مشاعروں کا اہتمام ہوا۔ ان سرگرمیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وقتاً فوقتاً کئی ادبی انجمنیں بنیں۔ ان انجمنوں کی نشستیں باقاعدگی سے وقفوں کے بعد ہوا کرتی تھیں جہاں ادبی مباحثے ہوا کرتے تھے اور شعر و نثر کی تخلیقات پڑھی جاتی تھیں۔ بعض انجمنوں نے وقتاً فوقتاً پرچے بھی نکالے اور اس طرح ادب کی اشاعت کا وسیلہ بن گئے۔ یہاں بعض انجمنوں کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔

منشی سراج الدین احمد کے زمانے میں ان کے مکان پر ریاستی اور غیر ریاستی ادیبوں کے اجتماع ہوا کرتے تھے۔ جن میں علامہ کیفی، ڈاکٹر تاثیر، سر عبدالقادر، ڈاکٹر کچلو، رام بابو سکینہ، عبدالمجید سالک، خوشی محمد ناظر، حفیظ جالندھری وغیرہ شامل ہوتے تھے۔ یہاں شعر و شاعری کے علاوہ نثری کارناموں پر بھی مباحثے ہوتے تھے۔ جموں میں قیس شیروانی، اللہ رکھا ساغر، نرسنگھ داس نرگس نے کئی ادبی انجمنیں تشکیل دیں۔ کشمیر میں پردیسی مرحوم نے حلقہ اربابِ ذوق منظم کی۔ اس کے بعد رامانند ساگر کے اشتراک کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کھولی۔ اس کی نشستیں پہلے پردیسی کے مکان پر اور بعد میں ایس پی کالج ہال میں ہوا کرتی تھیں۔ رامانند ساگر نے اپنا مشہور ناول "اور انسان مر گیا" قسط وار ان ہی نشستوں میں پڑھا تھا۔ پردیسی اور پریم ناتھ در نے اپنی مشہور کہانیاں اسی دور میں لکھیں۔ ۱۹۴۴ـ۱۹۴۵ کے آس پاس "انجمن ترقی اردو" کی تشکیل اور تنظیم ہوئی۔ اس تنظیم نے اپنی شروعات اقبالیات سے متعلق تقاریر کے سلسلے سے کی۔ اس انجمن کے جلسوں میں ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر یوسف حسین خان، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر ہادی حسن وغیرہ نے کئی مقالات پڑھے اور اقبال کے فن اور فلسفے کے کئی گوشوں

پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر تاثیر نے اپنے دوران قیام اردو سبھا کو تشکیل دی۔ اس انجمن کا ایک رسالہ بھی شایع ہوا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستانی حملے کے دوران اندرونی دفاع کے لئے نیشنل ملیشا قایم ہوا۔ اس کے ساتھ ایک کلچرل فرنٹ بھی منظم کیا گیا۔ اس محاذ سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے عوام کا لہو گرمانے والے گیت اور نظمیں تخلیق کیں اور ڈرامے اور کہانیاں لکھیں۔ یہ کہانیاں ڈرامے اور رپورتاژ ہمارے نثری خزانے میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ "مجاہد شیروانی" اور "سوالی" اس دور کی تخلیق ہیں۔ محمود ہاشمی کا "یہ کشمیر ہے" اس دور کا ایک قابلِ قدر اردو ڈرامہ ہے جو کلچرل فرنٹ کی طرف سے اسٹیج ہوا۔ پردیسی نے ایک رپورتاژ "چودہ دن" اسی زمانے میں لکھا۔

اس عبوری دور کے بعد کلچرل فرنٹ آل سٹیٹ کلچرل کانفرنس میں تبدیل ہوا اس میں مصنفین، مصور اور تھیٹر کے فن کار شامل تھے۔ اپنی انتہا پسندی کے باوجود اس انجمن نے فکر و نظر کی روشنی پھیلائی اور شعر و ادب کو مالا مال کیا۔ یہ اسی انجمن کی دین تھی کہ نثر کے مختلف شعبوں میں نہ صرف مواد کے لحاظ سے ترقی ہوئی بلکہ ہیئت اور فارم میں بھی تبدیلی آئی اور حقیقت آمیز ادب تخلیق ہوا۔ "کونگ پوش" اور "آزاد" اسی انجمن کے ترجمان تھے۔ اس انجمن کا شیرازہ بکھرنے کے بعد کئی اور انجمنیں وجود میں آئیں۔ جن میں حلقہ علم و ادب، لٹریری فورم، انجمن ارباب ذوق، فروغ اردو جموں، بزم ادب، بزم اقبال، ادبی کنج جموں، بزم اردو ادب جموں، انجمن ادب جموں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے اداروں میں ریاستی کلچرل اکادمی ریڈیو کشمیر سرینگر اور جموں، دوردرشن کیندر سرینگر، اقبال انسٹی ٹیوٹ سرینگر، کشمیر اور جموں یونیورسٹی کے اردو شعبے قابلِ ذکر ہیں۔ ان اداروں کا قیام ۱۹۴۷ء کے بعد عمل میں آیا۔ یہ ادارے بڑے خلوص کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ اردو نثر کی ترقی میں ان اداروں کا عملی تعاون رہا ہے کلچرل اکادمی نے مشاعروں، مباحثوں اور سیمناروں کے

ذریعے اردو کی اشاعت میں حصہ لیا ہے بلکہ اس کی مالی معاونت سے بیجاسوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جو ایک گراں قدر اور بے مثال کارنامہ ہے۔

اور آخر میں ان نثر نگاروں، محققوں، کہانی کاروں اور ناقدوں کے کارناموں کا کیا ذکر کروں کہ اردو دنیا میں ایسا کون کورذوق ہوگا جو ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔ یہ بات ہمارے لئے باعث سعادت ہے کہ یہ مقتدر حضرات سال ہا سال سے ہمارے درمیان رہے ہیں۔ اور ہمارا حصہ بن چکے ہیں۔ میری مراد پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر شکیل الرحمن پروفیسر جگن ناتھ آزاد، مظہر امام، منظر اعظمی وغیرہ سے ہے۔ پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی نثری خدمات کو کون بھول سکتا ہے۔ انہوں نے کشمیر میں اپنے سات سال کے قیام کے دوران کشمیر اور کشمیری ادبیات پر کئی گراں قدر کتابیں لکھیں۔ کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ، دو بھائی دو ادیب، کشمیر میں اردو وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر زور مرحوم اور ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی یہاں رہ کر کشمیر سے متعلق کئی اچھے مضامین لکھے۔

ریاست جموں و کشمیر نے اردو نثر کے پھیلاؤ اس کی اشاعت اور توسیع اور اس کی خدمت گزاری میں جو کام کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگوں کو اس زبان کے ساتھ کتنی محبت ہے۔ اپنی علاقائی زبانوں، کشمیری، ڈوگری، لداخی کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ چاہا ہے کہ اس زبان کو آگے بڑھایا جائے کہ یہی ریاست میں رابطے کی زبان ہے اور اس کی مدد سے ہم ریاست کی کلچرل اکائیوں کے ثقافتی رشتے کو فروغ دے سکتے ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو تنقید و تحقیق

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کی عمر بھی کوئی سوسوا سو سال کے آس پاس ہو گی۔ مہاراجہ گلاب سنگھ (۱۸۴۶-۱۸۵۶ء) نے نہ صرف ڈوگرہ سلطنت کی بنیاد ڈالی بلکہ ریاست جموں وکشمیر کی حکومت قائم کی۔ اور وقت کے تقاضوں اور سیاسی مصلحتوں کے پیش نظر ریاست کے تعلقات دہلی اور لاہور کی سرکاروں کے ساتھ استوار ہوئے اس زمانے میں وسائل معاش کے ساتھ ساتھ تجارتی لین دین کے سلسلے میں عام لوگوں کو بھی دور دراز جگہوں پہ آنے جانے کے مواقع میسر ہوئے۔ اس باہمی اختلاط سے سیلانیوں اور تاجر پیشہ لوگوں کو مروجہ اردو میں جانکاری حاصل ہوئی۔

مہاراجہ گلاب سنگھ کے عہد میں ریاست کی درباری زبان فارسی تھی لیکن جموں کے بیشتر علاقوں میں ڈوگری کا بول بالا تھا۔ جو لسانی اعتبار سے پنجابی اور اردو کے قریب ہے لاہور اور پنجاب کے ساتھ اہل جموں کے تعلقات وادی کے

لوگوں سے مقابلتاً زیادہ استوار تھے کیونکہ کشمیر کے مقابلے میں جموں لاہور کے نزدیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوبہ جموں میں اردو زبان کے نقوش کشمیر کے مقابلے میں بہت جلد مرتب ہوئے۔ مہاراجہ رنبیر سنگھ (۱۸۵۷ - ۱۸۸۵ء) نے وقت کے تقاضوں کے پیش نظر نئے علوم و فنون کو رائج کرنے کے اقدامات کئے۔ اسی منصوبے کا ایک حصہ "بدیا بلاس" پریس اور ایک دارالترجمے کا اہتمام تھا۔ "بدیا بلاس" کے نام سے ریاست کا پہلا اخبار سرکاری گزٹ کے طور پر اسی پریس سے شائع ہوا۔ دارالترجمے کے اہتمام سے علاوہ ڈوگری اور ہندی کے اردو میں بھی مختلف مسودات ترجمے ہونے لگے۔ ریاست میں اردو زبان کی باقاعدہ شروعات یہیں سے ہوتی ہے۔ اسی زمانہ سے کشمیری ادیبوں اور شاعروں کی ادبی کاوشیں منظر عام پر آنے لگیں۔ میری مراد ان ادیبوں اور شاعروں سے ہے، جنہوں نے ترک وطن نہیں کیا تھا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ۱۸۸۰ء سے ۱۹۲۴ء تک کئی کشمیریوں نے لاہور، دہلی الہ آباد وغیرہ سے کئی اخبارات جاری کئے۔ ان میں علاوہ دوسری باتوں کے سیاسی سماجی اور معاشرتی مسائل پر مضامین لکھے جاتے تھے ۱۹۲۴ء میں جموں سے ریاست کا پہلا باقاعدہ اخبار "رنبیر" اور اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں کشمیر سے "وتستا" جاری ہوا۔ ان اخباروں کے اجراء ہونے سے ریاستی ادیبوں اور شاعروں کو ایک حوصلہ ملا اور وہ شعر و نثر کے مختلف شعبوں میں قلم چلانے لگے، لیکن اس ابتدائی دور میں ریاستی قلم کاروں سے اعلیٰ درجے کے ادبی کارناموں کی توقع کرنا عبث ہے۔ خاص طور پر تحقیق اور تنقید کے میدان میں جس میں زبردست کدو کاوش کے حوصلے کے ساتھ ساتھ محققانہ آہنگ، فکر و نظر کی وسعت اور تنقیدی شعور کی ضرورت ہے اس لئے بھی کہ اردو زبان ابھی ریاست میں گھٹنوں کے بل چلنا سیکھ رہی تھی۔

اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ تحقیق، تنقید کی پہلی سیڑھی ہے۔ تحقیق

کی عدم موجودگی میں صحیح تنقید ناممکن ہے تلاش و تحقیق کی شروعات شک و شبہ سے ہوتی ہے تنقید کیا اور کیوں کے سوال ابھارتی ہے۔ تحقیق ان سوالوں کے جواب فراہم کرتی ہے حل طلب مسایل کو حل کرنا تحقیق کا کام ہے جس کے ڈھانچے پر تنقید اپنی عمارت تعمیر کرتی ہے۔ فن پاروں کو گمنامی کی تاریکیوں سے نکال کر دریافت کرنا تحقیق کا کام ہے اور ان کے جوہر کی شناخت کرنا تنقید کا منصب ہے لیکن کشمیر میں ابھی اس قدر ادبی دفینے نہیں تھے کہ جسے گمنامی کی تاریکیوں سے نکال کر پرکھا جاتا اور نہ ہی اس منصب کو اس ابتدائی دور میں سمجھا گیا تھا۔ فکر و نظر کی کشادگی کے ساتھ بعد کے برسوں میں اس کی طرف توجہ دی اور ریاست کے محققین اور ناقدین نے اپنی بساط کے مطابق بڑے کارنامے انجام دیئے۔

ریاست میں تحقیق و تنقید کے شعبے میں ابتدائی کارنامے فوق مرحوم کے نام سے وابستہ ہیں۔ فوق نے جہاں تاریخ، ادب، فکشن اور شاعری کے میدانوں میں چراغ روشن کئے۔ وہاں تحقیق کے میدان میں بھی وہ پیچھے نہیں ہیں۔ اگرچہ ان کی تحقیق کا اصلی دائرہ تاریخ ہے لیکن انہوں نے بعض ایسے تذکرے بھی تالیف کئے تھے جنہوں نے اردو ادب سے متعلق تحقیق کا حق ادا کیا۔ تذکرہ اخبار نویساں، تذکرہ شعرائے لاہور، یادرفتگاں ایسی کتابیں ہیں جن کا تعلق اردو ادب کے ساتھ ہے اس کے بعد چند ایک مضامین لاہور کے اخبارات یا پھر ریاست سے شایع ہونے والے اخبارات میں نظر آتے ہیں۔ جو مختصر ہیں اور جو کسی اصول یا نظریئے کے پابند نظر نہیں آتے ایسے مضامین کی اہمیت نہیں ہے۔

محمد عمر اور نورالہیٰ اردو دنیا میں محمد عمر نورالہیٰ کے نام سے مشہور ہیں۔ جموں خطے سے تعلق رکھنے والے ان دو ادیبوں نے مشترکہ طور پر کئی ادبی کارنامے انجام دیئے افسانوں اور ڈراموں کی تخلیق کے ساتھ ساتھ انہوں نے ڈراموں کے متعلق کتنے قابل قدر کارنامے

انجام دیئے جن کی نوعیت تحقیقی اور تنقیدی ہے ان کا سب سے بڑا تحقیقی اور تنقیدی کارنامہ "ناٹک ساگر" ہے۔ جو اردو میں ڈرامہ نگاری پر پہلی کتاب ہے۔ ناٹک ساگر لاہور سے ۱۹۲۴ء میں شایع ہوئی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب اردو ڈرامے کی جامع تاریخ نہیں اور اس میں کئی خامیاں موجود ہیں۔ مگر اردو ڈرامے کا کوئی سنجیدہ قاری یا ناقد اس کتاب کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ۱۹۲۶ء میں محمد عمر نور الہٰی نے امانت کی "اندر سبھا" شایع کی۔ یہ ایڈیشن بھی لاہور سے شایع ہوا۔ اس ایڈیشن کی ایک خوبی یہ ہے کہ مرتبین کے حواشی اور مقدمے نے اسکی قدر و قیمت کو جانچنے کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ "اندر سبھا" کے اس ایڈیشن کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ مرتبین نے ڈرامے کو دو ایکٹوں اور کئی سینوں میں تقسیم کر کے ایک نئی صورت دی ہے۔ مرتبین کے حواشی اور مقدمے نے اس کی قدر و قیمت کو جانچنے کے مواقع فراہم کئے ہیں "اندر سبھا" کے اس ایڈیشن کو اردو ڈرامے کی تحقیق اور تنقید میں ہمیشہ نمایاں مقام رہے گا۔ اور محمد عمر نور الہٰی کی اس مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

تحقیق و تنقید کے شعبے میں عبدالاحد آزاد نے بڑی سنجیدگی سے قلم اٹھایا۔ آزاد نے ۱۹۳۵ء میں "حیات مہجور" کے عنوان سے ایک مختصر سا مقالہ لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ذوق جستجو نے اس کام کو کافی پھیلا دیا۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کافی ضخیم مسودہ تیار ہو گیا۔ یہ مقالہ اگرچہ ۱۹۴۷ء سے قبل لکھا گیا تھا۔ لیکن شایع نہ ہو سکا ۱۹۵۹ء میں پہلی بار ریاستی کلچرل اکادمی کے اہتمام سے یہ مسودہ "کشمیری زبان اور شاعری" کے عنوان سے تین جلدوں میں شایع ہوا آزاد زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن انکی کھوج اور تحقیق کے جذبے کو دیکھ کر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک بڑے محقق تھے اور گہری تنقیدی بصیرت کے مالک تھے اس زمانہ میں جب کشمیر میں رسل و رسایل کے موزوں ذرایع بھی موجود نہ تھے آزاد نے خود پا پیادہ دور دراز دیہاتوں میں گھومتے رہے

اور بڑی جگر کاوی سے اپنا مواد اکٹھا کیا۔ کشمیری زبان کے شعراء کے اس پہلے قابل قدر اور معتبر تذکرے میں للہ دید سے لیکر مہجور کے عہد تک بیشتر شعراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ اتنا ہی نہیں کہ آزاد نے صرف چند نام گنوانے پر اکتفا کیا ہو بلکہ مشہور اور معروف شعراء کا بھی ذکر کیا ہے اور انکے بارے میں مواد فراہم کر کے ان پر بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ آزاد کی بے پایاں محنت اور لگن اور انکی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے کتاب کے مقدمے میں علی جواد زیدی رقم طراز ہیں:۔

"آزاد کی نظر میں وسعت ہے انہیں تحقیق کرنے والوں کی ہمت اور صبر ہے ان کے قلم میں روانی اور سلاست ہے اور وہ ایک بڑے کام کے انجام دینے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔ کسی مشعل کے بغیر وہ تاریکیوں میں دردانہ چلے جاتے ہیں۔ صدیوں کے پردے چاک کرتے ہیں اور کم از کم چھ صدیوں پر پھیلے ہوئے مواد کو تین مختصر جلدوں میں یکجا کر دیتے ہیں۔ یہ بجائے خود ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے"۔

کشمیری زبان اور شاعری" جس کے لئے آزاد نے تاریخ ادبیات کشمیر" کا نام تجویز کیا تھا، کشمیری زبان کی شاعری کی تاریخ ہے لیکن اسے اردو ادب میں ایک قابل قدر محققانہ تصنیف قرار دیا جا سکتا ہے۔ آزاد پہلے محقق اور ناقد ہیں۔ جنہوں نے اردو زبان میں اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے انہوں نے تاریخی اور سماجی پس منظر سے مدد لیکر نتائج اخذ کئے ہیں اور نہ صرف اس زبان کے تدریجی ارتقاء پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ مختلف ادوار کے شعراء کے حالات بیان کر کے اپنی

پوری تنقیدی بصیرت کے ساتھ ان کے کلام کو پرکھا ہے۔ آزاد کو محض ایک تذکرہ نولیس قرار دینا حقیقت سے انحراف کرنا ہے۔ اس سے ان کے کارنامے کی اہمیت گھٹ جاتی ہے۔

آزاد ایک وسیع نظریے کے حامی نظر آتے ہیں۔ خود لکھتے ہیں:

"ہر انقلاب پرانی تہذیب و تمدن کو نئے سانچے میں ڈھالتا ہے۔ ادب بھی انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ اسکی ہر منزل پر نئے نئے روپ بدلتا ہے۔ مگر ہر نئے ادب کو پرانے ادب کے ساتھ گہرا رابطہ ہوتا ہے۔"

اس طرح آزاد ہر بدلتے ہوئے عہد کے ڈانڈے ماضی اور روایات کے ساتھ ملاتے ہیں اور یہی ان کے سائینسی نقطہ نظر کا غماز ہے۔ آزاد نے عملی تنقید کے چند اچھے نمونے بھی پیش کئے ہیں اور ساتھ اس پچھڑی ہوئی زبان کے قابل قدر سرمائے کو اردو قارئین تک پہنچانے کی سعی بھی کرتے ہیں۔ انکا یہ احساس قومیت کے زبردست جذبے پر استوار ہے ایک معمولی تعلیم یافتہ پرائمری سکول معلم کے تبحر علمی اور گہری نظر کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ وہ مغربی تنقید سے واقف نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی گہرا تنقیدی ادراک رکھتے ہیں۔ "نفسیاتی تحلیل" "ادب برائے ادب" ادب برائے حیات اجتماعی اور ادب اور زندگی کے رشتے کی وضاحت کرتے ہیں اور اپنی کتاب کے آغاز میں ان تمام انگریزی کتابوں کی فہرست مرتب کرتے ہیں۔ جن میں کشمیری زبان پر غیر ملکی مصنفین نے قلم اٹھایا ہے۔ ابتدائی حصوں میں تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ لیکن کتاب کی تیسری جلد میں آزاد نے ایک اچھا اور متوازن ناقد ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ غرض آزاد کی کتاب تحقیق اور تنقید کا قابل قدر کارنامہ

ہے جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

غالب شناسی کے سلسلے میں پنڈت نند لال کول طالب کی تصنیف جوہر آئینہ ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ طالب کشمیر کے بلند مرتبت شاعر تھے۔ برس ہا برس تک "زمانہ" کانپور، ادب لطیف، لاہور، نوائے ادب بمبئی اور دوسرے رسایل میں تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ غالب فہمی اور غالب شناسی سے متعلق انکے مضامین متعدد رسایل میں چھپتے رہے ہیں۔ "کلام غالب" پر انکی تنقید غیر جذباتی انداز میں ملتی ہے۔ انکی اس تصنیف کو صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

طالب کے معاصرین میں جموں خطے کے غلام حیدر چشتی بھی ابھار رہے ہیں۔ چشتی صاحب نے نثر اور نظم دونوں میں طبع آزمائی کی تھی۔ وہ اپنے عہد کے بہت اچھے ادیبوں اور محققوں میں شمار ہوتے تھے "اصلاح ادب" کا ایک اچھا تحقیقی کارنامہ ہے جس میں انہوں نے بڑی تلاش و جستجو کے بعد بڑے بڑے مشاہیر فن کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ اور زبان و بیان کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں کئی مباحث ابھارے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر حامد سیشور ورما نے اپنی کتاب "آریائی زبانیں" میں ایک نئے زاویہ نظر سے گی لسانی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ آریائی زبانوں کے رشتے سے اردو کے بعض لسانی مباحث کو پہلی بار ریاست کے کسی محقق اور ماہر لسانیات نے سائنٹفک بنیادوں پر اٹھا کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔

آزادی کے بعد اردو تحقیق اور تنقید نے کافی منزلیں طے کر لیں۔ ۱۹۴۷ء کے بعد دراصل ایک سائنٹفک عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ ادب کا تجزیہ بھی نفسیات، معاشیات اور سماجیات کی طرح سائنس کی روشنی میں ہونے لگا۔ اس نئے ذہنی رویے نے اردو تنقید اور تحقیق کے زاویے بدل دیئے اور نئے معیار اور اصول مرتب ہوئے تحقیق کے کارنامے جدید نفسیات اور سماجی علوم کی مدد سے انجام پانے لگے۔ مغربی علم و فن

کے مطالعے نے تحقیقی اور اقتصادی شعور کو جلا بخشی طرز بیان اور اسالیب کی شگفتگی نے ادبی تحقیق اور تنقید کو ریاضی کے فارمولائی انداز سے نکال کر سلامت اور صفائی سکھائی۔ ذہن کے دریچے کھل جانے سے تعصبات کم ہونے لگے اور اکثر حالتوں میں فن کی بازیافت تحقیق اور تنقید کا منصب ٹھہرا۔ انفرادی اور آزاد کارناموں کے ساتھ یونیورسٹیوں اور اکادمیوں کے توسط سے بھی اردو تحقیق اور تنقید کو سہارا ملا۔ ریاست جموں و کشمیر قومی پیمانے پر اس تبدیلی سے متاثر ہوئی اور یہاں کے صاحب فکر و نظر اس شعبے میں اپنے کارنامے انجام دینے لگے۔

آزادی کے بعد جو تحقیق اور ناقد ابھرے ان میں ڈاکٹر حامدی کاشمیری کا نام سرفہرست ہے انکی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ انہوں نے شاعری، افسانے، ناول، تحقیق اور تنقید جیسی مختلف اصناف پر اپنا قلم اٹھایا۔ ادھر چند برسوں سے انہوں نے تحقیق اور تنقید کو اپنا خاص موضوع بنالیا ہے۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات' غالبؔ کے تخلیقی سرچشمے' نئی حسیت اور عصری اردو شاعری" کارگہہ شیشہ گری' غالبؔ اور اقبال ناصر کاظمی کی شاعری' حرف راز' امکانات وغیرہ اس شعبے میں ان کے اہم کارنامے ہیں۔ حامدی اپنے تخلیقی ذہن فکر و نظر کی وسعت اور مغربی ادبیات کے گہرے مطالعے کی بدولت اردو تنقید میں اپنا ایک مقام بنا چکے ہیں۔ چونکہ خود شاعر اور افسانہ نگار ہیں اس لئے دونوں اصناف پر قدرت رکھتے ہیں۔ جدید اردو نظم اور یورپی اثرات ان کا پہلا تنقیدی اور تحقیقی کارنامہ ہے۔ حامدی نے بڑی عرق ریزی سے جدید اردو نظم کے صوری اور معنوی پہلوؤں کا مطالعہ کیا ہے اور اردو نظم پر یورپی اثرات کی نشاندہی کرکے ایک خالص تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مطالعہ حالیؔ اور آزاد کے عہد سے لے کر ۱۹۴۰ء تک کی نظمیہ شاعری پر محیط ہے۔ اس کتاب کے بیشتر حصے تحقیقی نوعیت کے ہیں جہاں انہوں نے اردو شاعری کے دور قدیم میں

نظم کی اصطلاحات کی روایات حالی سے قبل کی اردو شاعری اور اردو نظم کے ابتدائی نقوش کو تلاش کیا ہے۔ اسکے بعد کا حصہ تنقیدی ہے اور یورپی اثرات کے تحت ابھرنے والے اہم شعری رجحانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ "غالب کے تخلیقی سرچشمے" میں غالب کی نفسیات کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے اور غالب کے فکری سرچشموں کی بازیافت ہوئی ہے۔ حامدی آرٹ کی قدر و قیمت متعین کرتے وقت شاعر سے زیادہ شعری کائنات کو اہم قرار دیتے ہیں اور بقول خود اسی آئینے میں شعری شخصیت کے نفسیاتی خدوخال تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ فنکار کی نفسیاتی زندگی کے اسرار کھولتے وقت آرٹ کی فنی اور جمالیاتی قدروں کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں اسی نقطہ نظر کو سامنے رکھا گیا ہے۔

نئی حسیت اور عصری شاعری" ایک تنقیدی کارنامہ ہے۔ ادھر کئی برسوں سے جدیدیت، شاعری اور نئی شعریات کے مباحث پیدا ہوئے ہیں۔ شروع میں یہ مسائل انتہائی کھردرے اور الجھے ہوئے تھے اور نئی شاعری کی آڑ میں اچھے شعری نمونوں کے ساتھ ساتھ ناقص کھردرے، غیر شعری نمونے بھی سامنے آئے۔ جہاں اس کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ وہاں بعض لوگوں نے ان چیزوں کو اس لئے قبول کیا کہ جدیدیت کی دنیا میں انہیں جاہل، کور ذوق، اور روایت پسند نہ سمجھا جائے حامدی بھی جدیدیت کے میلان سے متاثر ہیں۔ لیکن اس کے پس پشت ان کے احساس اور جذبے کی دیانت ہے۔ انہوں نے محض کورانہ تقلید سے کام نہیں لیا ہے بلکہ ان مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی ہے ان کی کتاب اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ انہوں نے بقول شمس الرحمن فاروقی ایک بڑے خلا کو بھرنے کی سعی کی ہے۔ حامدی اس کتاب میں اپنی پوری تنقیدی بصیرت سے جدید اردو شاعری کی فضا کو اچھی طرح سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سے متعلقہ مباحث

کے لئے راستہ کھول دیتے ہیں۔

"کارگہہ شیشہ گری" میں میر کا مطالعہ ایک نئے انداز سے ملتا ہے۔ اس تصنیف میں انہوں نے میر تقی میر کی شاعری میں پوشیدہ تخیلی کائنات میں حسیاتی اور علامتی پیکروں کو کھوجنے اور انکی معنویت کو پرکھنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ ناصر کاظمی پر حامدی کی مختصر کتاب اسی سلسلے کی ایک اور کڑی ہے۔ اسمیں حامدی معروضی طور پر ناصر کاظمی کی شاعری کی لفظی تجسیم کاری کے ذریعہ سے انکی شعری شخصیت کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے وہ شاعر کے شعری عمل اور لاشعوری عوامل پر خاص دھیان دیتے ہیں۔ حرف راز میں اقبال پر اور امکانات میں مختلف تنقیدی مضامین ملتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد ابھرنے والے محققین میں ڈاکٹر اکبر حیدری بھی ہیں۔ انہوں نے اردو کی کلاسکی شاعری پر کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ انکی سعی جمیل سے کئی قدیم نسخے سامنے آئے ہیں۔ وہ ہمارے پہلے محقق ہیں جنہوں نے مرثیہ تذکرہ اور کلاسکی شعراء پر بطور خاص کام کیا ہے۔ حیدری صاحب کی اہم تصانیف میں میر انیس بحیثیت رزمیہ شاعر، میر ضمیر، دیوان میر، شاعر اعظم مرزا دبیر، اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقاء، تذکرہ شاعرات اردو، دیوان نامی، تحقیقی نوادر، تذکرہ میر حسن بخط میر حسن، تذکرہ ہندی بخط مصحفی، مثنوی میر حسن وغیرہ اہم ہیں۔ حیدری صاحب نے اپنے بعض مقالات میں متنازعہ فیہ مباحث ابھارے ہیں۔ انکی بعض آراء سے اختلاف کی گنجائش ضرور ہے۔ لیکن ان کا حوصلہ انکی ہمت اور کام کے ساتھ ان کی لگن قابل داد ہے۔

اردو کے خدمت گزاروں میں ڈاکٹر عزیز احمد قریشی کا نام بھی شامل کیا جاسکتا ہے عزیز احمد کا بنیادی موضوع دینیات رہا ہے۔ اس موضوع پر انہوں نے کئی کتابیں اردو میں لکھی ہیں لیکن شعر و ادب کے ساتھ بھی انکی دلچسپی رہی ہے۔ جدید تنقیدی زاویے

اور انقلابی شاعری اس ضمن میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ کتابیں بقول مصنف طالب علموں کی ضرورت کے پیش نظر لکھی گئی ہیں اور ان کی بنیاد خود ان کے زمانہ طالب علمی میں تیار کئے ہوئے نوٹ ہیں، لہذا ان کتابوں میں شعر و ادب کے باریک رموز کی تلاش عبث ہے۔ پھر بھی ڈاکٹر عزیز نے خاصا مواد اکٹھا کیا ہے اور اسے ترتیب و تنظیم دے کر اپنے مخصوص نقطۂ نظر کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد یوسف ٹینگ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ اردو اور کشمیری ادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالب، اقبال، منٹو ان کے محبوب موضوع ہیں کشمیری اور اردو کے شعر و ادب سے متعلق ان کے بعض عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے چھپ چکے ہیں۔ مختلف کتابوں پر لکھے ہوئے ان کے مقدمے بذاتِ خود ایک مستقل عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے نہ صرف ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ ان کی تنقیدی بصیرت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کے شگفتہ اسلوب اور منطقی استدلال سے ایک نئی سوچ و فکر کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شناخت حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمد زماں آزردہ کا تحقیقی مقالہ "مرزا سلامت علی دبیر، حیات اور کارنامے" چھپ چکا ہے۔ یہ مقالہ ایک غیر جانبدار مطالعے پر مبنی ہے۔ اس مقالے میں دبیر کے صحیح ادبی مقام کو متعین کرنے کی ایک مستحسن کوشش ملتی ہے نہ صرف یہ کہ اس مطالعے میں حیاتِ دبیر کے بعض ایسے گوشوں کو تلاش کیا گیا ہے۔ جو نظروں سے اوجھل تھے، بلکہ دبیر کے غیر مطبوعہ کلام اور ان کی دوسری کاوشوں کو دریافت کرکے ایک کارنامہ انجام دیا گیا ہے۔ اس مقالے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں دبیر کے اصلی اور الحاقی کلام کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے دبیر کے کلام کا اصل جوہر کھل جاتا ہے۔ اور ان کے صحیح مرتبے کی پہچان ہو جاتی ہے۔ زماں کے متوازن اور سنجیدہ اسلوب نے مقالے میں جان ڈالی ہے ادھر زماں کئی برسوں سے سنجیدہ موضوعات کی طرف بھی متوجہ

ہوئے ہیں اور ملک کے مختلف رسایل میں ان کے کئی تحقیقی اور تنقیدی مضامین چھپ چکے ہیں۔ جو موضوع کے تنوع کے اعتبار سے اہم ہیں اور ان کی فکر و بصیرت پر دال ہیں۔

راقم السطور کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے مجموعے حرف جستجو، جلوہ صد رنگ، ذوق نظر، چند تحریریں کشمیر کے مضامین شایع ہو چکے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ان مضامین میں راقم کے مشاہدے مطالعے اور تلاش و جستجو کی چند کیفیتیں شامل ہیں۔ جو راقم کے ذہنی رویے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ مضامین اردو فکشن کے بعض فن کاروں کے تخلیقی عمل اور انکی تخلیقات کے بعض اہم پہلوؤں کے تجزیاتی مطالعے پر مبنی ہیں۔ راقم نے ان مضامین میں اور دوسرے ایسے مضامین میں جو ملک کے مقتدر رسایل میں شایع ہو چکے ہیں۔ اپنی بساط بھر خلوص اور ادبی دیانت کے ساتھ تحقیقی اور تجزیاتی مطالعے پیش کرنے کی حقیر سی کوشش کی ہے۔ انکی قدر و قیمت کی پرکھ راقم کے قاری ہی صحیح معنوں میں کر سکیں گے۔ سعادت حسن منٹو پر راقم کا تحقیقی اور تنقیدی مقالہ منٹو کی حیات اور انکے کارناموں کے تجزیاتی مطالعے پر غالباً اردو میں اس انداز کی پہلی کتاب ہے۔ جس کی پذیرائی ہند و پاک کے سنجیدہ ادبی حلقوں میں ہوئی ہے۔ کشمیر کے سب سے بڑے افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی پر لکھی ہوئی کتاب بھی اسی نوعیت کی ہے۔ جو ابھی شایع نہیں ہوئی ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو صحافت کے عنوان سے گزشتہ برسوں میں صوفی غلام محی الدین کی کتاب شایع ہوئی ہے۔ اس کتاب میں اردو صحافت کی تاریخ بڑی عرق ریزی سے سمیٹ لی گئی ہے۔ اسمیں ریاست میں اردو صحافت کے آغاز سے لے کر حالیہ برسوں تک اخباروں کے اجرا، انکی درجہ بندی، ان کے احتساب، ان کی طاقت اور توانائی اخبارات کی فہرست ریاست اور ریاست کے باہر کے کشمیری اخبارات کی روداد شامل ہے۔ جو زبان حالت سے مصنف کی تلاش تحقیق کی صلاحیت پر دال ہے۔

دوسرے اہم نقادوں اور محققوں میں پروفیسر لشپ، پروفیسر جے لال کول، پروفیسر رحمان راہی، پروفیسر شمس الدین احمد، ڈاکٹر کاشی ناتھ پنڈتا، شمیم احمد شمیم مرحوم، امین کامل، غلام رسول نازکی، قیصر قلندر، موتی لال ساقی، بلدیو پرشاد شرما، رشید نازکی، بنسی نردوش، شرما محمد عبداللہ شیدا، اوتار کرشن رہبر، مرغوب بانہالی امر مالموہی۔ اسداللہ وانی، محمد امین اندرابی روسل پونپر، نشاط انصاری، سیف الدین سوز، مشعل سلطانپوری، شانتی سروپ نشاط، عشرت کشتواڑی، عبدالغنی شیخ لداخی، عبدالاحد رفیق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان ادیبوں، نقادوں اور محققوں نے شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر قابل قدر مضامین لکھے ہیں، جن کی اپنی اپنی اہمیت ہے۔

نئی نسل سے تعلق رکھنے والے نوجوان بھی بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ برج پریمی، حامدی مجید مضمر، اقبال فہیم، یوسف سلیم، ریاض رفاعی چند اہم نام ہیں۔ برج پریمی رومانی نے جدید اردو شاعری: چند مطالعے اور "اوراق" کے عنوان سے دو تنقیدی مجموعے شایع کئے ہیں۔ جدید اردو شاعری سے شعراء کے معروضی مطالعے پر ایک اہم تنقیدی مجموعہ ہے۔ اوراق میں چند جدید شعراء کا مطالعہ ایک نئے انداز نظر سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کتابوں کا مطالعہ ایک ابھرتے ہوئے ذہین ناقد کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔ اقبال فہیم بت شکن ہیں۔ ان کی تحریروں میں نئے ذہن کی آگ ہے جو بعض اوقات بنا چاہے بھی اپنی بات منوا لیتی ہے۔ مجید مضمر نئے اردو افسانے کے اچھے ناقد ہیں۔ ادھر ان کے کئی اہم مضامین شایع ہوئے ہیں۔ یوسف سلیم وجودیت کے فلسفیانہ افکار اردو شاعری میں تلاش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کئی اچھے مضامین لکھے ہیں۔

ڈاکٹر ظہور الدین کا تحقیقی مقالہ "بیسویں صدی کے اردو ادب میں انگریزی رجحانات" ایک اچھا کام ہے۔ ظہور الدین نے اپنے مقالے میں اردو کے ساتھ انگریزی ادب کے اہم رجحانات کو بڑی محنت سے تلاش کیا ہے اور ان کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے بڑی دیدہ وری

کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے انگریزی ماخذوں سے اپنا مواد اکٹھا کیا ہے اور پھر بیسویں صدی کے اردو ادب میں ان رجحانات کو دریافت کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے ان کی دوسری اہم کتاب اردو ڈراما ہے۔ جس نے ایک بڑی کمی کی تلافی کی ہے۔ ڈاکٹر عابد پشاوری کا مقالہ انشا اللہ خان۔ حریف اور حلیف اردو کے کلاسیکی سرمایے میں اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے انشا کی نثری خدمت کا تجزیہ کیا ہے اور کئی تاریک گوشوں پر روشنی ڈالی ہے۔ کنول کرشن بالی کی تصنیف "آزاد نظم اور اردو شاعری" بھی اپنے موضوع کی مطابقت سے اچھا کام ہے۔

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، شعبہ اردو جموں یونیورسٹی اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی ریاستی کلچرل اکادمی ان سب اداروں نے تحقیق اور تنقید کے شعبے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ان کا ذکر کئے بغیر ریاست میں اردو تحقیق اور تنقید کا باب لکھا نہیں جا سکتا شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے رسائل آگہی، نیا شعور، بازیافت اقبال انسٹی ٹیوٹ کا "اقبالیات" کلچرل اکادمی کا "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" اس سمت میں برس ہا برس سے خاصا کام کر رہے ہیں۔ ان رسالوں میں اعلیٰ معیار کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ جن سے ریاستی محققوں اور ناقدوں کی علمی اور ادبی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔ دونوں یونیورسٹیوں میں تحقیق اور تنقید کے شعبوں میں جو کام ہوا ہے۔ اس کو تفصیل سے بیان کرنا یہاں ممکن نہیں میں صرف چند کارناموں پر اکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر اسد اللہ کامل نے اردو میں "سیرت النبیؐ کا ادب" پر کام کیا ہے۔ اس مقالے میں کامل نے ایسی کتابوں کی نشاندہی کی ہے جو معراج العاشقین سے قبل اردو میں لکھی گئی ہیں اور جن کا موضوع سیرت ہے۔ کامل صاحب کا مقالہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اسمیں سیرت نبوی سے متعلق تقریباً دو ہزار کتابوں کا ذکر ملتا ہے جن میں اعلیٰ درجے کی کتابوں کا ادبی مقام متعین کیا گیا ہے ڈاکٹر نذیر احمد ملک

کا تحقیقی مقالہ "اردو رسم خط، ارتقاء اور جائزہ" ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما کی لسانیاتی موضوع پر لکھی ہوئی اہم کتاب کے بعد ریاست میں پہلی بار لسانیات کے موضوع کا احاطہ کرتی ہے۔ مقالے میں کئی مسودات کے عکس تحریر شامل ہیں جن میں خاص طور پر دکنی مخطوطات (مثلاً دیوان قلی قطب شاہ اور شمالی ہندوستان کے مخطوطات مثلاً بکٹ کہانی) کے بعض عکس اہم ہیں۔ ڈاکٹر محبوبہ وانی نے "اردو اور کشمیری شاعری میں رومانی رجحانات" پر مقالہ لکھا ہے اور بڑی محنت سے اردو شاعری کے رومانی رجحانات کے اثرات کو کشمیری ادب میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح سے یہ مقالہ دونوں زبانوں کے رشتے کی بازیافت پر ایک اچھی سعی ہے۔ شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی کے دوسرے اہم تحقیقی اور تنقیدی مقالوں میں ڈاکٹر طاہرہ عبداللہ کا آغا حشر کی ڈرامانگاری، ڈاکٹر شاہدہ پال کا اردو ناول میں کردار نگاری، ڈاکٹر سبحان کور کا اردو تنقید میں غالب شناسی ڈاکٹر نذیر احمد بٹ کا اردو تنقید میں اقبال شناسی، ڈاکٹر شفیقہ پروین کا اردو شاعری میں میر کی روایت، ڈاکٹر سوہن لال کول کا انیسویں صدی کی اردو نثر میں سماجی طنز، ڈاکٹر مجید مضمر کا اردو افسانے میں علامت نگاری، ڈاکٹر تسلیم باندے کا سیاسی شعور اور پریم چند کی سیاسی کہانیاں، ڈاکٹر فریدہ کول کا ابوالکلام کی اردو نثر، ڈاکٹر دل افروز گنجو کا عصمت چغتائی۔ شخصیت اور فن۔ ڈاکٹر امر مالموہی کا اردو ناول میں داستانی روایات، ڈاکٹر حمید اللہ بٹ کا کشمیر کی اردو شاعری میں تشخص کی پہچان، ڈاکٹر مشعل سلطانپوری کا اردو کے ترقی پسند شاعری کا اثر کشمیر کی ترقی پسند شاعری پر شامل ہیں۔ شعبہ اردو جموں یونیورسٹی کے زیر اہتمام بھی کئی اہم مقالے لکھے ہیں جن میں ڈاکٹر مظفر اعظمی کا اردو میں تمثیل نگاری، ڈاکٹر تہمینہ اختر کا "اردو ادب میں گاندھیائی اثرات۔ سردار کرتار سنگھ کا بیدی کا فن" اسداللہ وانی کا "جموں کشمیر میں اردو افسانہ، ۱۹۴۷ء کے بعد" محمد شریف ملک کا ٹھاکر پونچھی "حیات اور کارنامے" اور رام رتن چاڈک کا پشکر ناتھ حیات اور فن" اچھے

کارنامے ہیں۔ دونوں شعبوں میں اس وقت کئی اہم تنقیدی اور تحقیقی کارنامے انجام دیئے جارہے ہیں۔

اقبال انسٹی ٹیوٹ میں پروفیسر آل احمد سرور کی بصیرت افروز رہنمائی میں قابل قدر تحقیقی اور تنقیدی کام ہوا ہے۔ گزشتہ برسوں میں انسٹی ٹیوٹ کے جریدے "اقبالیات" کے کئی شمارے منظر عام پر آئے ہیں۔ اسی طرح "اقبال اور مغرب" "اقبال اور تصوف" "اقبال اور مغربی فکر" جیسی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اہم موضوعات پر اس وقت تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں۔

اردو تحقیق اور تنقید کی ترویج و اشاعت میں ریاستی کلچرل اکادمی کی مساعی کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ برسوں میں اکادمی کی طرف سے اس سلسلے میں کافی کام ہوا ہے۔ اکادمی کے زیر اہتمام جو کتابیں تصنیف، تالیف یا ترجمہ ہوئی ہیں۔ ان میں جدید ڈوگری ادب کا ارتقاء (نیلامبر دیو شرما) ڈوگری لوک گیت اور پہاڑی آرٹ (نیلامبر دیو شرما) نکات و رقعات غالب (اکبر علی خان) دیوان میر (ڈاکٹر حیدری) تفسیر غالب (ڈاکٹر گیان چند جین) نئی حسیت اور عصری اردو شاعری (حامدی کاشمیری) اور کئی دوسری کتابیں قابل ذکر ہیں اکادمی کے زیر اہتمام شائع ہونیوالے اردو رسائل "شیرازہ" اور "ہمارا ادب" سارے ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان رسائل میں ریاست کے محققوں اور ناقدوں کے علاوہ ملک کے جن عالموں کے اعلیٰ پایہ کے تحقیقی اور تنقیدی مضامین شائع ہورہے ہیں۔ ان میں عبدالقادر سروری، احتشام حسین، اسلوب احمد انصاری، اکبر علی خان، ڈاکٹر شکیل الرحمن، اختر انصاری، امتیاز علی عرشی، ثمینہ شوکت، ملک رام، خلیل الرحمن اعظمی، خلیق انجم، ڈاکٹر رضی الدین احمد، سری نواس لاہوٹی، پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر شمیم حنفی، علی جواد زیدی، علی عباس حسینی، پروفیسر نصیر الدین ہاشمی، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر عالم خوندمیری، پروفیسر شنوان چشتی، قاضی عبدالودود، قمر رئیس، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر گیان چند جین،

پروفیسر محی الدین قادری زور، عتیق صدیقی، میکش اکبرآبادی، نورالسعید اختر، درگیندر پرشاد سکسینہ، ہنس راج رہبر، اظہر پرویز وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان رسالوں کے کئی خاص نمبر بھی شائع ہوئے ہیں جو اس لئے اہم ہیں کہ ان میں تحقیق و تنقید کا حق ادا کیا گیا ہے۔

آخر میں ان محققوں اور نقادوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ جو اگرچہ سرزمین جموں و کشمیر سے تعلق نہیں رکھتے۔ مگر یہ حضرات اردو ادب کی آبرو ہیں۔ اردو دنیا میں کون ایسا کور ذوق ہوگا۔ جو ان کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔ یہ بات ہمارے لئے باعث افتخار ہے کہ یہ معتقد حضرات برس ہا برس سے ہمارے درمیان موجود ہیں اور ہمارا حصہ بن گئے ہیں یہیں رہ کر انہوں نے کئی کارنامے انجام دیئے ہیں۔ جن کی اردو تنقید و تحقیق میں دستاویزی حیثیت ہے۔ میری مراد پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، اثر لکھنوی ڈاکٹر محمد دین تاثیر، خلیفہ عبدالحکیم، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر شکیل الرحمن، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گیان چند جین، ڈاکٹر محمد حسن، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر عالم خوندمیری وغیرہ سے ہے۔

پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم کی خدمات کو کون بھول سکتا ہے۔ تحقیق کے ساتھ ان کی لگن جنوں کی حد تک تھی۔ انہوں نے کشمیر کے اپنے سات سالہ قیام کے دوران کئی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں جموں و کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ۔ دو بھائی دو بھائی اور تین ضخیم جلدوں میں کشمیر میں اردو لکھی۔ تینوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان تینوں کتابوں کی دستاویزی اہمیت ہے۔

پروفیسر آل احمد سرور اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ کو انہوں نے ایک فعال ادارہ بنایا۔ گزشتہ چند برسوں میں سرور صاحب کی نگرانی میں کئی سیمینار ہوئے۔ جہاں بڑے عالمانہ تحقیقی اور تنقیدی مقالے پڑھے۔ یہ مقالے ریاست اور ملک بھر کے ماہرین اقبالیات کے غور و فکر اور تلاش و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان میں سے بیشتر مقالے

ایسے ہیں جو ادب کے فکر و فن کے تشخص کو شعوری پیداوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اقبال انسانی نفسیات کے ... ہیں ... ان کی اشاعت کا بھی ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اقبالیات کے موضوع پر ... اس ادارے نے ... اور تحقیقی کام کیا ہے۔

پروفیسر شکیل الرحمان نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کشمیر میں گذارا ہے۔ انہوں نے اردو کی خدمت کا ... صرف کیا ہے۔ شکیل صاحب کا شعور ... بہار ... اردو کے تنقیدی نظریات کی تشکیل ... دوران ان کی ... شائع ہوا۔ ... تنقید ... شعبے سے تعلق رکھتی ہے۔ شکیل صاحب ... ہر ایک ... جمالیات کی روشنی میں فن اور فنکار کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ نفسیات ادب ... کو بھی بنیادی اہمیت دیتے ہیں اور ان کو اسی ... وہ ... کی پہچان ... جمالیاتی شعور کی شناخت اور ... کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شکیل الرحمان فرائڈ، یونگ، ایڈلر ... اور دوسرے مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات سے متاثر نظر آتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمالیات اور خاص طور پر ہندوستانی جمالیات کی روشنی سے بھی فیض حاصل کرتے ہیں۔ جمالیات ان کا محبوب موضوع ہے اور اس کی بصیرت سے وہ تنقید میں بھی کام لیتے ہیں۔ اردو کے جدید نقادوں میں وہ اپنے نظریے کے باعث منفرد مقام رکھتے ہیں۔ کشمیر میں قیام کے دوران انہوں نے ادبی تنقید کو ادبی قدریں اور نفسیات، غالب کی جمالیات، ادب کا ... اقبال روشنی کی جمالیات، اقبال اور فنون لطیفہ، شعور اور تنقیدی شعور ... شکیل ... کی رومانی شاعری، فیض احمد فیض کی شاعری کا آہنگ، مرزا غالب اور ... جمالیات ... پیدا کی ہیں۔ یہ کتابیں موضوع کی ندرت، فکر و نظر کی وسعت، اعلیٰ تنقیدی اہمیت اور اپنے اسلوب کی انفرادیت کے باعث کافی اہم ہیں۔

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا پہلا عشق اقبال ہے۔ ریاست میں اپنے قیام کے دوران انہوں نے اقبال اور کشمیر، اقبال اور مغربی مفکرین، نشان منزل جیسی کتابیں لکھیں، آزاد صاحب ایک صاحب نظر محقق اور ناقد ہیں۔ انہوں نے "اقبال" کے کئی ایسے پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو گوشہ تاریکی میں پڑے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر عابد پشاوری کی نئی تصنیف "انشا حریف و حلیف" ہمارے کلاسیکی ادبیات کے مطالعے میں اضافہ ہے۔

بڑی ناانصافی ہوگی، اگر میں دوسرے غیر ریاستی نقادوں اور محققوں کا ذکر نہ کروں، یہ حضرات اگرچہ ابھی بہت قلیل عرصہ سے ہمارے درمیان موجود ہیں، لیکن انہوں نے بھی اس دوران اپنے کئی قیمتی مقالات سے ہماری تحقیق اور تنقید کے سرمائے میں اضافہ کیا ہے۔ میرا اشارہ مظہر امام، ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر منظر اعظمی، ڈاکٹر کبیر احمد جائسی، ڈاکٹر قدوس جاوید وغیرہ سے ہے۔

تنقید اور تحقیق کے اس نسبتاً کم سن شعبے میں، ہمارے کارنامے قلیل سہی۔ مگر اردو ادبیات کا کوئی بھی سنجیدہ قاری ان کے متنوع موضوعات اور ان کے اعلیٰ معیار کے پیش نظر ان کو صرف نظر نہیں کر سکتا۔

سعادت حسن منٹو اور کشمیر

تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف سیاسی حالات کے پیش نظر کشمیر کی آبادی کا ایک حصہ کشمیر سے بھاگ کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آباد ہوا اور اپنی خداداد قابلیت کے باعث اپنے لئے بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان ہجرت کرنے والے خاندانوں میں کئی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دیئے۔ ان میں سے بعض ایسے مشاہیر کے نام ملتے ہیں جن کی تخلیقات نے اردو شعر و ادب کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ ان میں سے اقبال، چکبست، سرشار، دیا شنکر نسیم، مومن، آزردہ، تربھون ناتھ ہجر، علامہ کیفی، آغا حشر، رامانند ساگر، قدرت اللہ شہاب اور دوسرے لوگ قابل ذکر ہیں۔ اس فہرست میں سعادت حسن منٹو کا نام ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ انہوں نے اردو کے مختصر افسانے کو موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے نئی وسعتوں سے ہمکنار کیا۔

منٹو کشمیری الاصل تھے۔ ان کے بزرگ علامہ اقبال کی طرح کشمیری پنڈت تھے۔ وہ برہمنوں کی سارسوات خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب میں آباد

ہو گئے تھے۔ اس کی تصدیق خود منٹو اور ان کے دوستوں نے کی ہے۔ منٹو اپنی خود نوشت سوانح عمری میں لکھتے ہیں :۔

"میں کشمیری ہوں۔ بہت عرصہ ہوا ہمارے آباؤ اجداد کشمیر سے ہجرت کر کے پنجاب آئے اور مسلمان ہو گئے۔"

کرشن چندر نے منٹو کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ اپنے کتابچہ "سعادت حسن منٹو" میں انہوں نے منٹو کو کشمیری ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وقت گزرنے کے باوجود منٹو کا مزاج کشمیری ہی رہا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ہے، لکھتے ہیں :۔

"مزاج، جسم، اور روح کے اعتبار سے منٹو آج بھی کشمیری پنڈت ہے۔"

منٹو کو اپنے کشمیری الاصل ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کشمیر اور کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ ان کی اکثر تحریروں میں اس جذبے کا پرتو ملتا ہے۔ وہ کشمیر کا ذکر کرنے سے کبھی کتراتے نہیں تھے۔ حتیٰ کہ اپنے آپ کو "ہاتو" کہلانا بھی پسند کرتے تھے خود کہتے ہیں :۔

"میں کشمیری ہوں —— ایک ھاتو"

اپنی ایک تصنیف لاؤڈ اسپیکر میں اعتراف کرتے ہیں :۔

"میں بھی کشمیری ہوں۔ مجھے کشمیریوں سے بہت محبت ہے لیکن میں ایسے کشمیریوں سے نفرت کرتا ہوں جو اپنی بیویوں سے برا سلوک کریں۔"

ان کے ایک دوست محمد اسداللہ نے اپنی کتاب "منٹو —— میرا دوست" میں تفصیل سے لکھا ہے کہ وہ کشمیر سے والہانہ عشق کرتے تھے اور اس کا بار بار ذکر کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں :۔

"اگر کبھی کوئی امرتسری یا کشمیری آدمی ان کی طرف آنکلتا

تو اس سے بڑے بے تکلف ہو جاتے۔ بار بار اس کو بتلاتے
تھے کہ میں بھی کشمیری ہوں۔ ویسے امرتسری ہوں۔ عالم یہ ہوتا
تھا کہ بار بار ناک صاف کر رہے ہیں سگریٹ پر سگریٹ
جلا رہے ہیں۔ اٹھ اٹھ کر اندر جا کر ایک پیگ چڑھا رہے
ہیں اور امرتسر اور کشمیر کی باتیں کر رہے ہیں۔"

ان کے لنگوٹیے ابو سعید قریشی نے بھی اپنی کتاب "منٹو" میں منٹو کی کشمیر سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اسے اپنے کشمیری ہونے پر بڑا ناز تھا"

منٹو کی کئی پشتیں امرتسر میں رہتی آئی تھیں۔ لہٰذا امرتسر کی گلی گلی سے وہ واقف تھے اور امرتسر کے ذکر سے ان پر والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود کشمیر ان کی دوسری کمزوری تھی۔ منٹو نے کشمیر سے یہ محبت وراثت میں پائی تھی۔ ان کے والد مولوی غلام حسن بھی کشمیریوں سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ کشمیری وضع کی پگڑی پہنتے تھے اور ان کا مزاج کشمیریوں سے ملتا جلتا تھا۔ وہ کشمیریوں سے اس طرح ملتے تھے جیسے وہ ان کے جسم کا ایک انگ ہوں۔ اپنے والد بزرگوار کے کشمیریوں سے عشق کا ذکر منٹو نے اپنے ایک مضمون "شاعر کشمیر مہجور" میں یوں کیا ہے:۔

"میرے والد صاحب کو کشمیریوں سے عشق تھا۔ مجھے اچھی طرح
یاد ہے کہ وہ کبھی کبھی اس عشق کے زیر اثر کسی ہاتو یعنی مزدور
کو پکڑ کر اپنے ساتھ لے آیا کرتے تھے اور اسے بیٹھک میں بٹھا
کر بڑے فخر سے کہا کرتے تھے ——— میں بھی کاشر ہوں"

منٹو کو بعض لوگ منٹو کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔ منٹو کا لفظ ان کے خاندانی نام "منٹ" سے ماخوذ ہے جو کشمیر میں ۱½ سیر کے بٹے کے طور پر استعمال ہوتا آیا ہے۔ یہ نام اب بگڑتے بگڑتے منٹو ہو گیا ہے۔ منٹو نے اپنی ذات کا [illegible] خود لکھا ہے:۔

"کشمیر کی وادیوں میں بہت سی ذاتیں ایسی ہوتی ہیں۔ جن کو "آل" کہتے ہیں جیسے نہرو، سپرو، کچلو وغیرہ وغیرہ منٹ کشمیری زبان میں تولنے والے بٹے کو کہتے ہیں ہمارے آباؤاجداد اتنے امیر تھے کہ اپنا سونا چاندی بٹوں میں تول تول کر رکھتے تھے۔"

یہاں اس بات سے بحث نہیں کہ منٹو نے اپنی ذات کے بارے میں جو کلیہ پیش کیا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں۔ البتہ یہ بات واضح کرنا لازمی ہے۔ کہ منٹو ذات کے لوگ اس وقت بھی کشمیر میں ملتے ہیں اور ان کا ذریعہ معاش اکثر تجارت ہے۔ ان کی ذات "منٹ" یعنی ½ اسیر کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وابستہ ہے۔ "منٹو اور من وٹی" دراصل قسط باشی پنڈتوں کی ذاتیں ہیں۔ [۱] فوق کا خیال ہے کہ جن لوگوں نے آگے چل کر اسلام قبول کر لیا وہ منٹو کہلائے اور جو اپنی اصل پر قائم رہے۔ وہ "من وٹی" کے نام سے مشہور ہوئے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج بھی شہر سری نگر اور وادی کے کئی مقامات پر دونوں ذاتوں کے لوگ موجود ہیں اور کئی ہندو گھرانوں کی ذات بھی منٹو ہے۔

منٹو خاندان کے ایک بزرگ خواجہ رحمت اللہ تھے۔ جن کا پیشہ سوداگری تھا۔ وہ اس خاندان کے پہلے بزرگ تھے جو پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں آکر مقیم ہو گئے۔ ان کے پوتے خواجہ جمال الدین سکھوں کے عہد حکومت میں امرتسر چلے گئے اور پشمینہ سازی کے کام کو فروغ دیا۔ اور اسے صرف لاہور تک ہی محدود نہ رکھا بلکہ امرتسر اور بمبئی تک پھیلا دیا۔ ان کے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی غلام حسن تھے۔ جو بعد میں سب جج ہوئے۔ مولوی غلام حسن کے بارہ بچوں میں ایک سعادت حسن منٹو تھے۔ لاہور اور امرتسر میں رہائش کے باوصف منٹو خاندان کے طرز حیات میں کافی عرصے تک کوئی نمایاں تبدیلی پیدا نہ ہو سکی حتٰے کہ اس خاندان کے افراد کے نام بھی خالص کشمیری رہے۔ مثلاً "حمزہ جو، رسول جو" احمد جو" تاج مالی، نندن مالی وغیرہ — یہ نام آج بھی کشمیر میں ملتے ہیں۔

---

[۱] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم السطور کی کتاب "سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے" (اب۔پ)

منٹو کی شادی ایک کشمیری گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس میں ان کی ذاتی دلچسپی کے ساتھ ساتھ ان کی والدہ کی مرضی کا زبردست ہاتھ تھا۔ ان کی بیوی افریقہ کے مشہور قومی کارکن خواجہ شمس الدین کی بھتیجی تھیں۔ ان کے تایا افریقہ کی پارلیمنٹ کے ممبر تھے اور جب منٹو کے ساتھ رشتے کی بات چیت ہو رہی تھی تو وہ افریقہ سے منٹو کو دیکھنے کے لیے بمبئی آئے تھے۔ منٹو کی رفیقہ حیات بیگم صفیہ منٹو کے والد کا خاندان سال ہا سال سے افریقہ میں رہائش پذیر تھا۔ وہاں منٹو کے دو بڑے بھائی بھی بیرسٹری کرتے رہے تھے لہٰذا ان کو رشتہ پسند آیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ خود کشمیری الاصل تھے لہٰذا لڑکی کا رشتہ کسی کشمیری خاندان میں کرنا چاہتے تھے۔ بیگم صفیہ جی کے والد افریقہ میں پولیس انسپکٹر تھے لیکن وہیں کسی حبشی نے انہیں ایک بلوے میں قتل کر دیا تھا۔ اب ان کے چچا ہی ان کی پرورش کرتے تھے۔ منٹو نے اپنی زندگی کی پوری تصویر ان کے سامنے رکھ دی لیکن یہ جان کر منٹو کو خود ہی تعجب ہوا کہ وہ اس رشتے پر رضامند ہو گئے۔

منٹو نے شادی سے پہلے اپنی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ ان کی ماں نے انہیں بتایا تھا کہ لڑکی بڑی ہوشیار اور سلیقہ مند ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ کشمیری ہے۔ منٹو اس بات سے بہت خوش ہوئے۔ انہیں جو کچھ معلوم ہوا اس کی تفصیل مزے لے لے کر اپنے دوست احمد ندیم قاسمی کو اپنے ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:۔

> "میری شادی مکمل طور نہیں ہوئی ہے۔ میں صرف "نکاحیا" گیا ہوں۔ میری بیوی لاہور کے ایک کشمیری خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا باپ مر چکا ہے۔ میرا باپ بھی زندہ نہیں وہ چشمہ لگاتی ہے۔ میں بھی چشمہ لگاتا ہوں۔ وہ ۱۱ مئی کو پیدا ہوئی۔ میں بھی ۱۱ مئی کو پیدا ہوا تھا۔ اس کی ماں چشمہ لگاتی ہے۔ میری والدہ بھی چشمہ لگاتی ہے۔ اس کے نام کا پہلا حرف "ص" ہے۔ میرے نام کا پہلا حرف بھی "س" ہے ......"

منٹو کو زندگی بھر افسوس رہا کہ انہوں نے کبھی اپنی کھلی آنکھوں سے کشمیر کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف بٹوت تک اس زمانے میں آئے تھے جب انہیں دق کا مریض قرار دے کر علی گڑھ یونیورسٹی سے نکال دیا گیا تھا۔ یہاں وہ صرف تین ماہ رہے لیکن صحت پھر بھی سنبھل نہ سکی۔ یہیں ان کا پہلا عشق پروان چڑھا جس نے ان کے دل و دماغ کو مسحور کر دیا۔ اس عشق کی پرچھائیاں ان کے بہت سے افسانوں میں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ "ایک خط" "بیگو" "مصری کی ڈلی" "لالٹین" وغیرہ اس ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ منٹو کو اس بات کا بھی افسوس تھا کہ وہ کشمیری زبان سمجھ اور بول نہیں سکتے تھے۔ کشمیری زبان کے سربرآوردہ شاعر مہجور کی شاعری کے جو تراجم انہوں نے پڑھے تھے۔ اس سے وہ مہجور کے پرستار بن چکے تھے۔ خاص طور پر جب انہیں اس بات کا علم ہوا کہ مہجور نے ظلم و ستم سہہ کر بھی ان کے والدین کی طرح ترک وطن نہیں کیا تھا تو ان کے دل میں مہجور کی توقیر اور بھی بڑھ گئی تھی۔ مہجور کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"مجھے ندامت ہے کہ میرے آباؤ اجداد نے ہجرت کی جور و ستم سہنا بڑی بات ہے لیکن ہجرت بہت بڑا حزا ہے۔ مہجور نے ظلم و ستم سہے۔ اس نے سب سے بڑی اذیت جو ذہنی خصوصیت ہے برداشت کی، مگر وہ ڈٹا رہا۔ ہجرت کا خیال تک بھی اس کے دماغ میں آیا۔۔۔۔ مہجور کے کلام کا ترجمہ پڑھنے کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہجر ہی اس کا وصال ہے۔۔۔۔۔۔"

منٹو ہند و پاک کشیدگی سے ناخوش تھے۔ انہیں اس بات کا بے حد قلق تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے سربراہ دونوں کشمیری ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مہجور زندہ ہوتے تو حالت کچھ اور ہوتی (حالانکہ ۱۹۴۷ء کی ہند و پاک کشیدگی کے وقت مہجور زندہ تھے) اپنے شاعرانہ اور جذباتی نقطہ نظر کو انہوں نے اپنے مضمون

"شاعر کشمیر ــــــ مہجور کشمیری" میں یوں بیان کیا ہے:-

"اگر وہ زندہ ہوتا تو میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر گراہم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ اپنے قلندرانہ انداز میں جواہر لال نہرو اور خواجہ ناظم الدین کو (یہ بھی کشمیری ہیں) سمجھا دیتا کہ دیکھو انسان کا خون پانی سے ارزاں نہیں ہے۔ کشمیری خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو، ہر حالت میں کشمیری ہے۔ تم جواہر لال نہرو ہو ــــ یہ ناظم الدین ہے۔ دونوں کشمیری ہو۔ .... تم گوگجی اور بت (شلغم اور چاول) کے ایسے دستر خوان سے کبھی نکال نہیں سکتے ہو۔ پھر تم کیوں لڑتے ہو؟ شلغم اور بھات کی قسم کھاؤ کیا تم ایک دوسرے کے گریبان میں ہاتھ ڈال سکتے ہو۔؟"

منٹو کی اکثر تحریروں میں کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر ملتا ہے۔ ان کی بعض کہانیاں کشمیر اور کشمیر کی زندگی کے بعض پہلوؤں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندوستان و پاکستان کی کشیدگی پر ان کی کہانیاں "آخری سیلوٹ" "ٹیٹوال کا کتا" وغیرہ اہم مقام رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں میں منٹو کی انسان دوستی سے دھڑکتی ہوئی روح صاف نظر آتی ہے جہاں مذہب، رنگ اور نسل کا کوئی بھید بھاؤ نہیں ملتا۔ اسی طرح ان کی بہت سی کہانیوں کا پس منظر کشمیر ہے اور ان کے کردار کشمیری ہیں۔ ان کے یہاں متعدد بار ایسے استعاروں پر نظر جاتی ہے جن میں کشمیر کی مہک ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کشمیر کو اپنے لاشعور میں سے نکال نہیں سکے تھے۔ منٹو کی بیشتر کہانیوں، مضامین اور دوسری تحریروں میں کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر بڑے چاؤ سے ملتا ہے۔ ان کا احاطہ کرنا یہاں طوالت کا باعث ہوگا۔ یہ سب باتیں ایک علیحدہ مضمون میں بیان کی جاسکتی ہیں۔ لیکن یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تقسیم ملک کے وقت منٹو ہندوستان میں تھے۔ اس کے بعد ہی ہندو پاک کشیدگی کا آغاز ہوا۔ اور پھر منٹو پاکستان چلے گئے۔ جہاں انہوں نے ٹھنڈا گوشت، کھول دو، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور

اسی نہج کی کہانیاں لکھیں۔ کشمیر سے متعلق ان کی دو کہانیاں اسی زمانے کی یادگار ہیں "ٹیٹوال کا کتا" اور "آخری سیلوٹ" لیکن ان کی وفاداریاں کہاں ہیں؟ ان میں وہ ہندوستانی منٹو ہے اور نہ پاکستانی منٹو ـــــ وہ صرف منٹو ہے، جس کی وفاداری انسانیت سے ہے۔ ان کی فکر و نظر، جذبۂ احساس میں مذہب کا، رنگ کا، نسل کا، مملکت کا ـــــ کوئی تعصب نہیں، کوئی بھید بھاؤ نہیں۔ بلکہ وہ دلوں کی خلیج کے درمیان امن، صلح، دوستی، محبت اور بھائی چارے کے پل باندھنا چاہتا ہے۔

"کچھ نہیں ارے رام سیاں ـــــ بھول ہی گیا تو سور کے
نلا ـــــ کہ لڑائی ـــــ یہ لڑائی؟"

اس پُر آشوب دور میں بڑے بڑوں کے حوصلے شکست تھے۔ بڑے بڑوں کی وفاداریاں بٹی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ بڑے بڑے ادیب اور افسانہ نگار قتل اور خون اور لوٹ مار اور عصمت ریزی و زنا کا کھاتہ کھولے بیٹھے تھے اور اس میں برابر برابر کا اندراج کر رہے تھے۔ منٹو چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ہندوستان اپنا وطن ہے یا پاکستان
اور وہ لہو کس کا ہے جو ہر روز اتنی بیدردی سے بہایا جا رہا ہے؟
وہ ہڈیاں کہاں جلائی یا دفن کی جائیں گی جن پر سے مذہب
کا گوشت پوست چیلیں اور گدھ نوچ نوچ کر کھا گئے تھے۔"

کشمیر سے متعلق منٹو کی کہانیاں، ڈوگرہ شاہی مظالم کے خلاف ان کا ردعمل، غنی اور مہجور کی شاعری سے عشق کشمیر کھلی آنکھ سے نہ دیکھنے کا ارمان، فخر سے اپنے آپ کو "کاشر اور ہاتو" کہنا یہ اور ایسی بے شمار باتیں سعادت حسن منٹو کے لاشعور میں چھپی وہ ناتمام آرزو تھی۔ جس کی تشفی وہ چاہتے تھے لیکن نہ ہو سکی؛ موت ان کو بے وقت نہ چھینتی تو شاید ان کی آرزو پوری ہو جاتی ـــــ کون جانے؟ منٹو کے خاندان میں صرف ان کے بڑے بھائی خواجہ سلیم حسن منٹو ایک بار اہل خاندان کے ساتھ ۱۹۲۱ء کے دوران کشمیر آئے تھے اور میاں منٹو خاندان کے بعض افراد سے مل کر اتنے خوش ہوئے تھے کہ کئی روز خوشی کے مارے سو نہ سکے تھے۔ مدتوں تک

وہ اس قصے کو اپنے خاندان میں فخر سے دہراتے رہے تھے۔ لیکن منٹو تب بھی کشمیر نہ آسکے تھے۔

منٹو کے چچا چچا جان خواجہ حبیب اللہ کا انتقال ۲۰، جون ۱۹۲۴ء کو سری نگر میں نوے برس کی عمر میں ہوا تھا اور وہ یہیں دفن ہوئے۔ منٹو کو ان کی قبر کی زیارت بھی نصیب نہ ہو سکی۔

سعادت حسن منٹو زندگی بھر اس ناتمام آرزو کی تشنگی سے کُڑھتے رہے۔ وہ وقت کی بے رحمی کے آگے بے بس تھے اور زندگی بھر رہے ـــــ

سعادت حسن منٹو، ہماری تاریخ کا ایک جاندار حصہ ہیں۔ ہم انہیں کیسے فراموش کر سکتے ہیں؟

آرل سٹائن کے خطوط

—— رام چندر بالی کے نام

کلہن اور اس کی راج ترنگنی کا ذکر جب بھی ہوتا ہے تو سر آرل سٹائین کا نام فوراً ذہن میں آتا ہے۔ اس لئے کہ کلہن کو سمجھانے میں جس قدر حصہ اس غیر ملکی نے ادا کیا وہ بجائے خود ایک کارنامہ ہے۔ راج ترنگنی کے ترجمے کے ساتھ اس کی تاویلیں اور اس کے گراں قدر حواشی اس شخص کے تبحر علم، کام کی لگن، محنت اور ذہانت کا زندہ ثبوت ہیں۔ سر آرل سٹائین نے اپنی زندگی کی کئی قیمتی گھڑیاں کشمیر میں گزاریں اور اپنے گراں بہا کارنامے انجام دیئے ان کارناموں کی تکمیل میں کئی کشمیریوں کا ہاتھ رہا ہے۔ آرل سٹائین علم ادب، ثقافت، تاریخ، آثار قدیمہ اور ایسے ہی دوسرے علوم کے سچے عاشق تھے۔ ۲۵ سال تک محکمہ آثار قدیمہ کے ساتھ وابستہ رہنے کے دوران انہوں نے علاوہ دوسرے کاموں کے کشمیر اور کشمیر سے متعلق کئی کارنامے انجام دیئے اور ان کارناموں کی تکمیل کے دوران انہوں نے مقامی عالموں اور فاضلوں سے استفادہ کیا۔ ان میں خاص طور پر پنڈت گوبند کول شاستری اور پنڈت نتیانند شاستری جیسے سربرآوردہ عالم

تھے۔ اس کا اعتراف آرل سٹاین بار بار کرتے ہیں۔ راج ترنگنی کے دیباچے اور "حاتم کی کہانیاں" کے مقدمے میں پنڈت گوبند کول شاستری کی وہ جو تعریف کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سٹاین اپنے مددگاروں کے تئیں کس طرح کے جذبات رکھتے تھے مددگاروں کی ایسی لمبی فہرست میں جو برس ہا برس ان کے ساتھ رہے ایک غیر معروف نوجوان پنڈت رام چندر بالی بھی تھا۔ جو برسوں تک لائیڈس بینک میں ایک معمولی عہدے پر فائز رہا۔

رام چندر بالی ۱۸۸۹ء میں پنڈت راجہ رام بالی نام کے ایک کشمیری پنڈت کے یہاں پیدا ہوئے۔ روش زمانہ کے مطابق ابتدا میں فارسی، اردو اور سنسکرت زبانوں کی درسیات حاصل کیں اس کے بعد انگریزی تعلیم پائی۔ بی، اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔ کچھ عرصہ محکمہ صنعت و حرفت میں کام کیا زندگی کا بیشتر حصہ سر آرل سٹائن کی ملازمت میں گزارا۔ آخیر میں سٹیشنری اور سپلائی کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر ریٹائر ہوئے۔ وہ وائی ایم سی اے کی تربیت پانے والے پہلے کشمیریوں میں تھے۔ انہوں نے یہ تربیت لاہور میں پائی تھی اور "پٹ مین سسٹم" میں کافی مہارت حاصل کی تھی۔ آرل سٹائن کو اپنے کارناموں کی تکمیل کے لئے ایک نوجوان ٹائپسٹ اور کلرک کی ضرورت تھی۔ اس لئے ایک انٹرویو کا اہتمام کیا گیا جس میں کئی ذہین کشمیریوں نے حصہ لیا۔ لیکن قرعۂ فال رام چندر بالی پر پڑا اور وہ آرل سٹائن کی ملازمت میں چالیس روپے ماہوار پر داخل ہوئے۔ بالی نے چند برسوں میں ہی آرل سٹاین کا دل جیت لیا اور وہ ان کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ان کی زبردست اور قابل اعتماد خدمات کے اعتراف میں سٹاین لکھتے ہیں:۔

"مجھے یہ کہنے میں بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ رام چندر بالی نے ۱۹۱۸ء کے موسم بہار سے بڑی گراں قدر خدمات انجام دیں گزشتہ چند سالوں میں مسلسل دو...

میری تیسری وسط ایشیائی مہم کے نتائج کی ترتیب
کے سلسلے میں مصروف رہے اور اس کے ساتھ
ساتھ کیٹیلاگ کی ترتیب اور اس مہم سے حاصل
کئے ہوئے زمانہ قدیم کے آثار جو میں سرینگر لایا
ہوں، کی ترتیب میں انہوں نے میری مدد کی۔
میں نے رام چندر کو بہت محنتی اور معتبر مددگار پایا
ہے ہم چاہیے کیمپ میں ہوں یا سردیوں کے
دوران سرینگر یا دہلی میں ہوں وہ ہمیشہ دفتری
اوقات کے بعد کام کرتے ہیں اور سب سے
بڑی بات یہ ہے کہ مسلسل طور پر میرے ساتھ
بڑے اونچے پہاڑوں اور سطح ہائے مرتفع پر بڑے
خراب موسمی حالات میں رہے جس سے ثابت
ہوتا ہے کہ انہیں کام کرنے کی کس قدر زبردست
لگن ہے۔"

آرل سٹاین
۲۹ مئی ۱۹۲۴ء

رام چندر بالی، ۱۹۱۷ سے ۱۹۳۸ء تک تقریباً اکیس سال سر سٹائن کے ساتھ رہے اور ان کے ساتھ ہی برفانی پہاڑوں، گھنے جنگلوں اور دور دراز مقامات کی خاک چھانتے رہے۔ آرل سٹاین کی اس بامقصد آوارہ گردی میں رام چندر کے علاوہ صرف ان کا نوکر علیا ساتھ تھا جس نے اس قدر بھیانک مصائب کو جھیلا اور آثار قدیمہ کی چھان بین جستجو اور تلاش کے ان بڑے کارناموں کی انجام دہی میں بڑا کارنامہ انجام دیا ہو۔

مرسٹاین نے شروع میں رام چندر بالی کو ایک کلرک کی حیثیت سے بھرتی کر لیا تھا۔ بعد میں وہ ان کے معتمد خاص بن گئے تھے وہ اُن کی ملازمت سے ۱۹۲۹ء میں سبکدوش ہو گئے لیکن آخیر وقت تک ان کے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کا ثبوت سر سٹاین کی اس خواہش میں ملتا ہے جہاں انہوں نے اظہار کیا تھا کہ انہیں مرنے کے بعد رام چندر بالی کے ہاتھوں موہنڈ مرگ میں دفن کیا جائے۔ مگر ہائے وائے! سر سٹاین کا انتقال اکتوبر ۱۹۴۳ء میں کابل کے مقام پر ہوا اور ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی مگر اس کے بعد سر سٹاین کے دوستوں نے رام چندر بالی کے ساتھ رابطہ قائم رکھا اور یہ رام چندر ہی تھے جنہوں نے موہنڈ مرگ کی ایک چٹان کے پاس ایک لوح کندہ کروائی جس کا ذکر آگے آئے گا۔

سر آرل سٹاین ۱۸۸۸ء میں پہلی بار کشمیر آئے تھے۔ یہاں کی سیر و سیاحت کے دوران انہیں کلہن کی راج ترنگنی کو سنسکرت سے انگریزی میں منتقل کرنے کا خیال آیا۔ انہوں نے یہ کام سنبھالا اور ہزار طرح کی دشواریوں کے باوصف اپنی زبردست محنت اور سنسکرت کے کشمیری عالموں کی مدد سے یہ کارنامہ مکمل ہوا۔ اس کے بعد برس ہا برس تک سر سٹاین کا گرمائی مستقر کشمیر رہا اور وہ موہنڈ مرگ کی نظر فریب فضاؤں اور پہاڑوں سے ڈھکی ہوئی خاموش تنہائیوں میں اپنی جہاں گردی کے عملی تجربے کاغذ پر اتارتے رہے۔ کشمیر کے بے شمار صحت بخش مقامات اور مرگ زاروں میں انہیں یہ جگہ سب سے زیادہ پسند تھی۔ ان کو یہ جگہ اس قدر بھا گئی کہ یہ ان کی زندگی کا ایک قیمتی جزو بن گئی۔ حتیٰ کہ انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ موت کے بعد انہیں اسی جگہ دفن کیا جائے۔ ایک یوروپی عالم کی اس سرزمین کی خوشبو سے اس قدر والہانہ لگاؤ اس بات کا مبین ثبوت کہ سر سٹاین کشمیر کے قدیم کلچر، علم اور ادب ہی کے رسیا نہیں تھے بلکہ یہاں کی فضاؤں اور یہاں کی زمین کے بھی بڑے عاشق تھے۔ راج ترنگنی کے ترجمے کے علاوہ سر سٹاین نے وسط ایشیا اور دوسرے مقامات کے آثار قدیمہ کی کھوج سے جو نتائج حاصل

لئے تھے وہ اسی مرگ کی دلفریب تنہائیوں میں پایہ تکمیل کو پہنچے سر سٹائین عام طور سے ہر سال گرمیوں کے چند مہینے یہیں گزارتے تھے اور اپنے تجربوں اور مشاہدوں کے جوہر پر غور و فکر کرتے تھے اور پھر ان نتائج کو قلم بند کرتے تھے۔ ایسی ہی کئی گرمیاں اور سردیاں رام چندر بالی نے سر سٹائین کے ساتھ گزاریں۔ زمانے کے گرم و سرد سے بے نیاز یہ کشمیری نوجوان ایک قابل اعتماد ساتھی اور دوست کی طرح ان عظیم کارناموں کی انجام دہی کے لئے کوشاں رہا۔ انہیں نہ برستی بارشوں کا ڈر تھا نہ سرحدی علاقوں میں قبائلی حملوں کی پرواہ۔ ارل سٹائین کی عرق ریزیوں کو ٹائپ کے حروف میں اتارنا رام چندر بالی کا کام تھا۔

رام چندر بالی کے کاغذات میں سر سٹائین کے خطوط کا ایک نادر کلیکشن موجود ہے۔ یہ خطوط نجی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں سے بعض خطوط سے آرل سٹائین کی سرگرمیوں اور ان کی کشمیر کی سرزمین سے دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ آرل سٹائین اپنی طویل اور پُر خطر یوروپی اور وسط ایشیائی سیاحت کے دوران بار بار موہند مرگ کو لوٹنے اور اسے دیکھنے کی خواہش کرتے ہیں۔ کشمیر سے دلچسپی کے تعلق سے چند خطوط کے تراجم ملاحظہ ہوں:۔

نیپلز (اٹلی)

۲۵ جنوری ۱۹۲۵ء

میرے پیارے رام چندر

آپ کا ۲۱ دسمبر کا خط دو ہفتہ قبل ملا۔ جس سے مجھے بڑی مسرت ہوئی۔ میں اس میں آپ کی تصویر دیکھ کر خوش ہوا۔ شکریہ میں اس وقت براعظم یورپ کا سفر کر رہا ہوں۔ اس لئے خطوط لکھنے کے لیے بہت کم وقت مل رہا ہے۔ یہاں اٹلی کے

اس خوب صورت خطے میں قدیم آرٹ، آثار قدیمہ
اور دل چسپ کھنڈرات کی بہتات ہے۔
آپ کے خط سے مجھے اپنے پرانے کشمیری عالم
دوستوں میں سے پنڈت نیتانند کی علالت کا
حال جان کر بہت دکھ ہوا۔ میری خواہش ہے
کہ میں جب مئی کے آخر میں کشمیر آؤں تو انہیں
صحت یاب دیکھ سکوں۔ میں یہ بھی چاہتا ہوں
کہ موسم سرما میں جو سارے شمالی ہندوستان
میں سرد ہوتا ہے۔ آپ کے یہاں اس قدر برف
باری ہو کہ بہتر آب رسانی سے آپ کے یہاں
بہتر فصلیں ہوں۔

خلوص کیش
آرل سٹائین

معرفت الیسٹ انڈیا یونائیٹڈ سروس کلب
لنڈن۔ الیس ڈبلیو
۱۷ مارچ ۱۹۳۹ء

میرے پیارے رام چند!
براہ کرم پنڈت نیتانند سے بہت جلد ملئے اور ان
سے معلوم کیجیے کہ کیا انہیں وہ رقم ملی ہے جس
کا میں نے اکتوبر اور اب جنوری میں ان کے لیے
انتظام کروایا ہے۔ یہ انہیں اپریل تک مل گئے

ذریعے ملے گی۔ یہ رقم دراصل انہیں "ڈان کویک زوٹ" کے کشمیری اور سنسکرت ترجمے کے معاوضے کے طور پر دی گئی ہے۔ میں نے سنسکرت ترجمے کو صاف کرنے کے لیے پنڈت زاڑو کے ساتھ خط و کتابت کی تھی۔ کیا انہوں نے اس خط و کتابت کو ایک نظر دیکھ لیا ہے؟

مجھے بڑی مسرت ہوگی اگر پنڈت نیتا نند مجھے کسی عالم پنڈت کا نام تجویز کر سکیں جو ایک دلند یزی عالم کو نیل مت پران میں درج رسم و رواج کے بارے میں معلومات فراہم کر سکیں۔

خلوص کیش

آرل سٹاین

۲۲ مارپلیس

آکسفورڈ

۷-۱۱-۱۹۳۹ء

میرے پیارے رام چندر

آپ کا ۱۶۔ اپریل کا خط مجھے گزشتہ ماہ اس وقت موصول ہوا جب میں "ٹرانس جورڈن کے ریگستانوں" میں تحقیق اور "کھوج" کے کام میں مصروف رہا تھا۔ میں موسم گرما گزارنے کے لئے انگلستان واپس آ گیا ہوں اور جو نتائج میرے طویل سفر سے حاصل ہوئے ہیں

ان سے میرے دونوں ہاتھ بھرے ہوئے ہیں۔
میں اب بالکل بہ خیریت ہوں اور ریگستانی علاقوں میں اپنے مشکل کام سے محظوظ رہا ہوں۔ لیکن اب میرے سامنے ایک مشکل وقت آرہا ہے اس لئے انگلستان سے میرے خط کی توقع عبث ہے۔
مجھے توقع ہے اگر سب کچھ درست رہا اور کشمیر دوسری بہار میں آسکا تو مجھے آپ سے مل کر بے انتہا خوشی ہوگی۔

خلوص کیش

آرل سٹائن

معرفت پوسٹ ماسٹر سرینگر

۱۸-۱۲-۱۹۳۹ء

میرے پیارے رام چند بالی

۳۰؍ نومبر کے خط کے لیے آپ کا بے حد شکریہ۔ یہ خط مجھے سرینگر سے واپسی پر راستے میں ملا۔ آپ سے اچھی خبر پاکر مجھے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ اس سے پہلے مجھے آپ کا کوئی خط نہیں ملا۔ میں انگستان میں تھا جہاں عراق اور ٹرانس جورڈن میں پانچ ماہ کام ختم کرکے اب فراغت نصیب ہوئی ہے۔
میں سرینگر میں تقریباً دو ہفتے قیام کے بعد شمالی مغربی سرحدوں کی سیاحت کرنا چاہتا ہوں۔ مئی کے مہینے میں واپس جا رہا ہوں اور دوسرے سال گرمیوں

میں موہند مرگ میں کام مکمل کروں گا۔
میں بخیر ہوں اور انگلستان سے باہر بھی بہت خوشگوار وقت گزر رہا ہے۔

آپ کی صحت اور ترقی کا متمنی

آپ کا

آرل سٹاین

کیمپ معرفت پوسٹ ماسٹر سرینگر

۱۳ نومبر ۱۹۴۰ء

پیارے رام چند

میں وادی کشمیر میں اپنی سیاحت مکمل کر رہا ہوں۔ میرا مقصد قدیم مقامات (SITES) اور کھنڈرات کی تصویریں حاصل کرنا تھا تاکہ انہیں راج ترنگنی کے نئے ایڈیشن کے ترجمے میں شامل کر سکوں اس لئے ان تمام قدیم مقامات کی دوبارہ سیاحت کی جہاں گھومنے کی سعادت مجھے ۵۲ سال قبل نصیب ہوئی تھی۔ یہ سیاحت میرے لئے انتہائی دلچسپی کا باعث ثابت ہوئی

خلوص کیش

آرل سٹاین

معرفت پوسٹ ماسٹر بہاولپور

۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء

۲۴ دسمبر کے آپکے خط کے لیے بے حد شکریہ، یہ خط مجھے
دو دن قبل ملا اور میرے لئے نیک خواہشات کا پیغام
لے آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ معہ اپنے اہل خاندان
کے بخیر ہیں اگرچہ آپ عارضی طور پر ان سے علیحدہ ہیں۔
میں خود یہاں جنوری کے پہلے ہفتے میں با حفاظت
پہنچا اور تب سے اس صحرا سے کافی نیچے سندھ کی حدود
تک قدیم مقامات کے "جائزے" میں مصروف ہوں۔
ریاست بہاولپور کے ارباب اختیار اس کام میں
میری موثر امداد کر رہے ہیں۔ یہاں کے حکمران نے مجھے
ایک عمدہ موٹر کار سے نوازا ہے۔ میں بڑے آرام اور تیز
رفتاری سے کافی کام کرنے کے قابل ہوا ہوں۔ حتیٰ کہ
ریت کے بڑے بڑے ٹیلوں میں بھی کام کر رہا ہوں جو
اکثر اس سارے خطے کو چھپا دیتے ہیں۔
میں چند دنوں میں براستہ کراچی "لیس بیلا" کی
حدود کے اندر چلا جانا چاہتا ہوں جو "مکران" کے ساتھ
ملا ہوا ہے۔ یہاں سردیوں کے باعث غیر معمولی بارش
ہو رہی ہے۔ جو خشک زمین کے لیے مفید ہے۔ اگر حالات
سازگار رہے تو میں اپریل کے اوائل میں کشمیر آنا چاہوں
گا۔
مجھے چیئرمٹ نیتاننید کے سورگباش ہونے سے
بے حد افسوس ہوا۔

آپ کی خیریت اور خوشحالی کا متمنی
خیر اندیش
آرل سٹاین

اسی سال سر سٹاین کا انتقال ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو کابل میں ہوا۔ جب وہ کئی مہینوں سے افغانستان کے دور دراز علاقوں میں گھوم رہے تھے اور اپنی دلچسپی کے کام میں ہمہ تن معروف تھے۔ انتقال کے وقت آرل سٹاین کی عمر اکاسی برس کی تھی اور اس طرح سے اس سرزمین کے ساتھ جس کی روح کے ساتھ انہیں والہانہ پیار تھا نصف صدی پر پھیلے ہوئے تعلقات ختم ہو گئے۔ سٹاین ایک غیر ملکی عالم اور ماہر آثار قدیمہ ہونے کے علاوہ کشمیر کے ایک بڑے عاشق تھے۔ اس کا بین ثبوت راج ترنگنی کا شہرہ آفاق ترجمہ ہے جو اُن کے قلم سے ہوا جس نے کلہن کو ہندوستان اور ساری دنیا میں پہنچا دیا۔ علم و فضل اور قدرت کے لازوال حسن کا یہ عاشق ہر سال کشمیر آیا اور موہند مرگ کے خوبصورت سناٹوں میں اپنے تجربات اور جگر کاویوں کو الفاظ کے سینے میں اتارتا رہا تاکہ آنے والی نسلیں ان سے فیض یاب ہوں۔

سر سٹاین اور رام چندر بالی کے تعلقات کا اندازہ سٹاین کے دوست ٹریڈی ہنڈرسن انڈر ویز کے خطوط سے ہوتا ہے جو سٹاین کے انتقال کے بعد اینڈرویز نے رام چندر بالی کو لکھے تھے۔ اور جن میں آرل سٹاین کی اس آخری خواہش کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کے مطابق وہ چاہتے تھے کہ انہیں موہند مرگ کی معصوم اور پاک اور شبنم ہواؤں کے آنچل میں دفن کیا جائے لیکن یہ ناممکن تھا۔ رام چندر بالی نے اپنی تمام مشکلات کے باوجود اپنے عظیم دوست اور کشمیر کے اس عاشق کی یادوں کا احترام کرتے ہوئے ایک کتبہ کندہ کروایا جو برس ہا برس کی برفیلی ہواؤں کی تیز و تند آندھی اور ڈھول کے جھکڑوں کے باوجود آج تک وہاں موجود ہے۔

اینڈرریز کے یہ مخطوط خطوں کے اس نادر کلیکشن میں اب تک موجود ہیں۔ دو[۲] خطوں کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

۲۳۔ سیڈنیم ہل لندن

۱۴۔ اپریل ۱۹۴۷ء

پیارے پنڈت رام چند بالی

کئی برسوں سے مجھے آپ کے بارے میں کوئی خبر نہیں میں آپ کے بارے میں سوچتا رہا ہوں کہ آپ کیا کرتے رہے ہوں گے؟ اب یہ خط اس امید پر لکھ رہا ہوں کہ یہ خط آپ کو کھوج نکالے گا۔ آپ کو لکھنے کی فوری وجہ یہ ہے کہ ایک معاملے میں آپ کی امداد کا طالب ہوں یہ معاملہ ہمارے مشترکہ دوست مرحوم سر آرل سٹائین کی یادوں سے متعلق ہے۔

ان کی وراثت کے تعمیل کنندگان چاہتے ہیں کہ موہنڈ مرگ پر ایک کتبہ لگوایا جائے جس پر سر سٹائین کی محبوب کیمپنگ مرگ کا ذکر کیا جائے۔ تجویز یہ کیا جاتا ہے کہ ایک مناسب چٹان پر یہ کتبہ کندہ کروادیا جائے اور اس میں ان حقایق کا ذکر ہو۔ اس سلسلے میں پہلا کام ایک مستری کی تلاش ہے جو چٹان پر الفاظ کو تراش سکے اور جو اس مرگ پر جانے کے لئے رضامند ہو۔ آپ کشمیر میں تنہا آدمی ہیں جو اس مرگ میں اس جگہ سے اچھی طرح واقف ہیں اور صرف آپ

ہی صحیح جگہ کی نشان دہی کر سکتے ہیں۔ جہاں مناسب چٹان پر اس کتبے کو تراشا جا سکتا ہے۔ آپکو یاد ہوگا مرگ میں ایک ایسی جگہ موجود تھی جسے سر آرل سٹاین ہمیشہ اپنی قبر کہا کرتے تھے اور جہاں ان کی خواہش تھی کہ انہیں دفن کیا جائے لیکن یہ ممکن نہ ہو سکا کیونکہ آرل سٹاین کا انتقال کابل میں ہوا۔ اگر آپ اس مخصوص چٹان کو پہچان سکتے ہوں اور اگر اس پر الفاظ تراشنے کے لئے مناسب جگہ ہے تو یہ نہایت ہی مناسب ہوگا اور اگر مناسب جگہ نہ ہو تو کسی قریبی چٹان کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

کیا آپ، جب وہ وقت آئے، براہ کرم مستری کو اوپر اونچائی پر لے جا سکتے ہیں اور اسے مناسب جگہ دکھا سکتے ہیں۔ کتبے کے الفاظ کو پورے سائز کے کاغذ پر بھجوا رہا ہوں اور آپ کو یا اس شخص کو جس کا نام آپ تجویز کریں گے بھجوا دوں گا۔ آپ سے یہ معلوم کر کے کہ آپ اس کام میں ہماری امداد کر سکتے ہیں۔ سر سٹاین کے تعمیل کنندگان آپکو خرچہ ادا کریں گے۔

مجھے یقین ہے کہ آرل سٹاین کی یادوں کا احترام کرتے ہوئے آپ یہ کام بخوشی انجام دیں گے۔

میں اس معاملے میں آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا۔ جواب ہوائی ڈاک سے جلد بھجوا دیں۔

آپکی خیریت کا متمنی

نیک خواہشات کیساتھ
خلوص کیش
ٹریڈیہنڈرسن انڈرویز

۲۳۔ سینڈ ریم ہل لندن ایس۔ وی۔ ۲۶
۷ رمئی ۱۹۴۷ء

پیارے رام چند!

یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ کتبہ جسکی ایک نقل میں منسلک کر رہا ہوں "۲۴×۱۶" کے سائز میں ہو۔ تاکہ ایک مناسب چٹان پر سما سکے اور اس کے تراشنے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ میں مناسب وقت پر آپ کو حروف کی ڈرائنگ، مستری کی رہنمائی کے لئے بھیج دوں گا۔ ان کی ہو بہو نقل ہونی چاہیئے۔ اس سے پہلے مجھے اخراجات کا مکمل تخمینا معلوم ہونا چاہیئے تاکہ میں اسے ان کے تعمیل کنندگان کے سامنے رکھ سکوں۔ جب کام مکمل ہو اس کی تصویر کھینچ کر نقل مجھے بھجوا دیجیے تاکہ میں ان کے سامنے پیش کر سکوں۔

میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ چٹان محفوظ اور ڈھکی ہوئی جگہ پر ہو۔ اور اسے تقریباً دو انچ گہرائی میں کندہ کیا جائے۔ چونکہ وہ مخصوص مقام جو سر آرل سٹاین نے اپنی قبر کے لئے منتخب کیا تھا کھو جا

نہیں جا سکتا۔ میں آپ کی اس رائے سے متفق ہوں کہ ایک مناسب چٹان کا چناؤ کیمپنگ گراونڈ کے قریب ہو، انتخاب کیا جانا چاہیئے۔ یہ فیصلہ آپ پر منحصر ہے
آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ میں آپ کی امداد کی پیش کش سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کو اس بات سے خوشی اور اطمینان ہوگا کہ اس مرگ کے ساتھ ہم اپنے محبوب دوست کی وابستگی کی یادوں کو تازہ کریں۔ اس مرگ میں جہاں ہم نے نہایت ہی حسین ماحول میں ان کے کیمپ میں بیٹھ کر بڑی شادمانیوں کے ساتھ ان کی محبت کے مزے لوٹے تھے۔

خلوص کیش

ٹریڈہ ہنڈرسن انڈویز

سر آرل سٹاین نے کئی بار موہند مرگ کے من موہنے والے سناٹوں میں ایک مخصوص چٹان کے سایے میں مرگ کی خوشبودار مٹی میں جذب ہونے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اپنی روح کے نہاں خانوں میں چھپی ہوئی اس تمنا کا ذکر انہوں نے

ل رام چندر بالی کے صاحبزادے اور میرے عزیز دوست سوم ناتھ بالی پرکاش راوی ہیں۔ موہند مرگ کے مرگ زار کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت چشمہ ہے جہاں خودرو پھولوں سے گھری ہوئی ایک چٹان ہے جس پر برس ہا برس کی جغرافیائی تبدیلیوں سے لاتعداد شگاف پڑ چکے تھے اور کائی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس لئے اس چٹان پر ارل سٹاین کا یہ کتبہ کندہ کروانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ چنانچہ جے پور سے سنگ مرمر کی ایک سل منگوائی گئی جس پر کشمیر کے فن کاروں نے الفاظ تراش لئے۔ (ب۔پ)

رام چندر بالی سے بھی کئی بار کیا تھا۔ لیکن قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔ موت کے آہنی ہاتھوں نے سر سٹائین کی اس تمنا کی آسودگی کے مواقع چھین لئے اور ۸۱ برس کی عمر میں افغانستان کی سیاحت کے دوران کابل کے مقام پر ان کی اس تمنا کا گلا گھونٹ لیا۔

اس وقت رام چندر بالی ان کے ساتھ نہیں تھے۔

لیکن پھر سر سٹائین کی آخری خواہش کا احترام کرتے ہوئے رام چندر بالی ہی کے ہاتھوں یہ کتبہ موہند مرگ میں کندہ کروایا گیا۔

موہند مرگ

سر آرل سٹائین نے ۱۸۹۵ء کے موسم گرما جب کہ وہ راج ترنگنی
کی تالیف کر رہے تھے۔ اس مرگ میں پہلی بار اپنا کیمپ لگایا۔
بعد ازاں جب وہ اپنے سفر ہائے عظیم کا حال لکھ رہے تھے
کئی بار موسم گرما میں پھر یہاں آئے۔ ستمبر ۱۹۴۳ء میں یہاں
سے افغانستان روانہ ہوئے ۸۱ سال کی عمر میں بمقام
کابل ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو رحلت کر گئے۔

اس طرح سے کشمیر کے شاداب حسن اور صاحب کلچر کے ایک عظیم آوارہ گرد عالم غیر فانی کی کارگذاریاں اختتام کو پہنچیں۔ موہند مرگ کی تنہائیوں میں اس پُر اسرار چٹان میں ضرور کوئی ایسی لازوال کشش رہی ہوگی جس کو دیکھ کر آرل سٹائین کی آنکھوں میں ایک آن بوجھی روشنی چمکنے لگتی تھی اور وہ اپنے دوستوں اور ساتھیوں سے والہانہ انداز میں کہتے تھے۔ "یہ میری قبر ہے"

اس لازوال [illegible]

سے ہندوستان انڈویز رام چندر بالی یا پھر ان کے خانساماں علیا کو معلوم تھا۔ لیکن وقت کی آندھی ان کو بھی موت کی باہوں میں پہنچا گئی۔

یہ پر اسرار راز اب کسی کو معلوم نہیں ہو گا!

آنے والا زمانہ صرف سر سٹائین کے کارناموں کو یاد کرے گا۔ اس عاشق کو فراموش کرے گا جس نے کشمیر کے سارے حسن کو موہنڈ مرگ کے پر اسرار سناٹوں میں سمیٹ لیا تھا اور اپنے ان بوجھے خوابوں کو مشکبار کر دیا تھا۔

رام چندر بالی ایک عالم اور ماہر آثار قدیمہ نہ سہی لیکن کشمیر کے اس سچے عاشق کے شانہ بشانہ کام کرتے ہوئے ان کے کارناموں کی انجام دہی میں جو کام انہوں نے کیا وہ بذات خود ایک کارنامے سے کیا کم ہے۔ آج رام چند بالی کو کوئی نہیں جانتا جن کے بارے میں سر سٹائین نے ایک بار لکھا تھا۔

"اس طویل عرصے میں جب وہ تن تنہا بڑے ہی مشکل اوقات میں میری مدد کرتے رہے میں نے انہیں ذہین، قابل اعتماد اور زبردست مددگار پایا۔"

لیکن حق بات تو یہ ہے کہ رام چند بالی کو یہ اولوالعزمی محض ان کے فرائض منصبی کے باعث ہی حاصل نہیں ہوئی تھی بلکہ آرل سٹائین کی طرح وہ بھی اپنی سرزمین کے جیالے عاشق تھے اور اس عشق نے ہی انہیں سر سٹائین کے قریب کر دیا تھا۔

ایک اہم کتاب

سعادت حسن منٹو ۔ حیات اور کارنامے

ڈاکٹر برج پریمی کا معرکتہ الآرا تحقیقی و تنقیدی کارنامہ

چند تأثرات

• آپ کی کتاب مبارکباد کی مستحق ہے۔ اتنی محنت کم لوگ کرتے ہیں...... آپ نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے...... یہ کتاب تذکرہ ہے۔ تعصب سے بلند بالا جس میں فن کار کی تکریم اور فن کے کمال دونوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔

—— ابو سعید قریشی (کراچی)

• منٹو کے بارے میں چند جنوں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر مفصل اور مبسوط کتاب کوئی نہیں ہے اس لئے ہم ڈاکٹر برج پریمی کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنے تحقیقی مقالے میں منٹو پر ایک مکمل اور مبسوط کتاب لکھ دی ہے۔ —— خواجہ احمد عباس (مرحوم) بمبئی

• آپ کی کتاب سعادت حسن منٹو۔ حیات اور کارنامے بہت خوب ہے.... آپ کی تحقیق میں دردمندی اس طرح آمیز ہے کہ منٹو کی شخصیت خوب اُبھر کر سامنے آئی ہے۔ انداز بیان ایسا سُلجھا ہوا ہے کہ یہ تحقیق منٹو کے افسانہ سے کم دلچسپ نہیں۔

—— خواجہ احمد فاروقی (دہلی)

• برج پریمی نے سعادت حسن منٹو حیات اور کارنامے کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھا ہے جو ابھی تک منٹو پر شائع ہونے والے سبھی مضامین اور کتابوں پر بھاری ہے...... یہ کتاب ابھی تک منٹو پر حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے اور اردو کے افسانوی ادب کے ہر طالب علم کے لئے لائق مطالعہ ہے۔ —— ڈاکٹر محمد حسن (دہلی)

• آپ کی بیش بہا کتاب سعادت حسن منٹو ملی۔ کتاب خوب سے خوب ہے۔ بہت مفصل جامع اور تحقیقی۔ آخری جزو سعادت حسن منٹو۔ ایک نظر میں بیت الغزل ہے۔ کوزے میں دریا بھرنا اسی کو کہتے ہیں۔ کتنی زیادہ معلومات، کتنے تھوڑے صفحات میں سما دی ہیں۔

—— پروفیسر گیان چند جین (حیدر آباد)

• کتاب ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔ منٹو پر مواد آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ مگر آپ نے کافی محنت کی ہے...... اس سے ہر نیا کام کرنے والا مستفید ہو سکتا ہے۔

—— کالی داس گپتا رضا (بمبئی)

دیپ پبلی کیشنز کی چند مطبوعات

• حرفِ جستجو	ڈاکٹر برج پریمی	(تحقیق و تنقید)	25 روپے
• جلوۂ صد رنگ	"	"	35 روپے
• ذوقِ نظر	"	"	40 روپے
• چند تحریریں	"	"	55 روپے
• کشمیر کے مضامین	"	"	60 روپے
• جدید اردو شاعری — چند مطالعے	پریمی رومانی	"	20 روپے
• اوراق	"	"	40 روپے
• تحریر و تقریر	"	"	55 روپے
• منٹو کتھا	ڈاکٹر برج پریمی	"	(زیر طبع)
• پریم ناتھ پردیسی — عہد، شخص اور فن کار	"	"	"



ڈاکٹر برج پریمی ایک اچھے کہانی کار کی حیثیت سے اردو کے سنجیدہ حلقوں میں پہلے ہی سے متعارف ہیں۔ چند سال پہلے انہوں نے اپنے تنقیدی مقالات کو "حرفِ جستجو" کے عنوان سے چھپوا کر تنقید و تحقیق سے بھی اپنی ذہنی مناسبت کا ثبوت فراہم کیا ہے — ڈاکٹر برج پریمی ادب کی افہام و تفہیم اور تعینِ قدر کے مسائل سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ اب ڈاکٹر برج پریمی کی نئی کتاب بعنوان "جلوۂ صد رنگ" اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔

اس کتاب میں کشمیر کی تہذیبی، فنی، فکری، سماجی اور ادبی زندگی کے بعض اہم اور مستور پہلوؤں کے بارے میں گراں قدر تحقیقی، تنقیدی اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ بدقسمتی یہ ہے کہ کشمیریات، جیسا بسیار شیوہ اور وقیع موضوع ابھی تک سنجیدہ اہلِ قلم کی بھرپور توجہ کا مرکز نہیں بنا ہوا ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ اردو دنیا کے ایک محنتی، باذوق اور صاحبِ نظر نقاد نے اس پر قلم اٹھایا ہے اور پوری محققانہ ذمہ داری، خلوص اور ژرف نگاہی سے کام لے کر کشمیر کے تشخص کو نمایاں کرنے کا مستحسن اقدام کیا ہے۔

امید ہے ان کی یہ کتاب کشمیریات میں ایک باوقار اضافہ ثابت ہوگی۔

(ڈاکٹر حامدی کاشمیری)